ادبِ لطیف لاہور

جلد ۲۷ شمارہ ۳

جوُن ۴۸ء

مدیران:
چودھری برکت علی
ممتاز مفتی
عبدالمتین عارف

ترتیب

زرِ سالانہ آٹھ روپے
فی پرچہ ایک روپیہ

اداره

اشارات

سالنامہ آپ مطالعہ فرما چکے اور اس کے متعلق آپکی حوصلہ افزا آرا ابھی ہم تک پہنچ چکیں ہمیں مسرت ہے کہ آپنے ہماری پیشکش کو ہماری توقع سے کہیں بڑھکر سراہا اور اسے اپنی نظروں میں بلند مقام عطا کیا۔ اس وسیع پسندیدگی کے پیشِ نظر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم ادبِ لطیف کی گذشتہ عظیم روایات کو برقرار رکھنے کی نہایت اہم ذمہ داری سے ہم بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برا ہونے میں کامیاب ہوگئے ہیں اور احساس ہمارے لئے موجب تمانیت ہے!

لیکن حقیقتاً اس کامیابی کا سہرا ہم سے زیادہ ہمارے معزز قلمی معاونین کے سر ہے جنہوں نے اپنی بہترین تخلیقات سے ہمیں فائدہ اٹھانے کا موقع دیا۔ بہترین تخلیقات جن میں زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کی اُمنگ، رجعت پسند قوتوں سے متصادم ہونے کا ولولہ اور صالح اقدار کو کائنات پر مسلط کردینے کا عزم موجود ہے اور جو افادی معیاروں پر پورا اترنے کے ساتھ ساتھ فن کی بلندیوں اور حسن کی رفعتوں کی حامل ہیں!

افسانہ نمبر ابتدا سے ادبِ لطیف کا امتیازی نمبر رہا ہے۔ گذشتہ دو تین سال سے بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر یہ سلسلہ منقطع رہا۔ امسال ادارہ نے اس سلسلہ کی تجدید کا فیصلہ کیا ہے اور طے پایا ہے کہ اکتوبر کا شمارہ افسانہ نمبر کی حیثیت سے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ ہم اسے کامیاب ترین صورت میں مرتب کرنے کی تیاریوں میں ابھی سے منہمک ہوگئے ہیں۔ اُمید ہے کہ ہمارے فنکار ساتھی ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی اپنے فراخدلانہ تعاون کا ثبوت دیں گے اور جلد از جلد اپنی عالی مرتبت نگارشات ارسال فرماکر پرچہ کو بروقت شائع کرنے میں ہماری مدد کریں گے۔

ہماری ملکی آزادی کا ایک سال ختم ہوا چاہتا ہے۔ ہمیں اُمید تھی کہ یہ ہمارے معیارِ حیات کو بلند سے بلند تر کرنے میں مدد دے گی۔ مگر جب ہم اپنے گردوپیش کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ محسوس کرکے بے حد اذیت پہنچتی ہے کہ عسرت و نکبت ہم پر آج بھی اُسی طرح غالب ہے۔ جس طرح ایک سال پہلے تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سوراج کی آمد کے ساتھ ساتھ مصائب و آلام میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ آج بورژوا طبقہ ترقی پسند جمہوری قوتوں کو کچلنے کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ حاکمانہ اقتدار کو استعمال میں لا رہا ہے۔ ملک میں جگہ جگہ کسان اور زمیندار ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں اور اس ٹکر میں کسانوں کو پولیس اور فوج کی گولیوں کا شکار بننا پڑ رہا ہے۔ بڑی بڑی صنعتوں کو آج بھی قومی ملکیت بنانے کی بجائے پرائیویٹ اجارہ داروں کی تحویل میں دینے پر اصرار کیا جا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گذشتہ مہینوں میں ادیبوں اور دانشوروں نے اسی طرح کے دوسرے رجعت پرست حقائق کے خلاف احتجاج کرتے رہے ہیں مگر ابھی انہیں اپنی آواز کو اور بلند کرنا ہے۔ اپنے پروٹسٹ کو اور شدید کرنا ہے اور اس وقت تک اس عمل کو جاری رکھنا ہے۔ جب تک کہ ہماری سوسائٹی انسانیت کی معراج کو نہیں چھو لیتی!۔

ہمیں اُمید ہے کہ ادبِ لطیف کے آئندہ شماروں بالخصوص افسانہ نمبر میں ہمارے قارئین اپنے فنکاروں کے اس احتجاج کی مؤثر ترین بازگشت سُن سکیں گے!

عبادت بریلوی

تنقیدی جھلکیاں

ہمیشہ ہمیشہ سے دنیا کی تمام قوموں کی یہ امتیازی شان رہی ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے ہر حال میں اپنے اپنے ادبیات سے دلچسپی کا اظہار کیا ہے ۔ بڑی سے بڑی پریشانی اور بپتا پڑنے پر بھی وہ اس کو اپنے سینے سے لگائے رہی ہیں ۔ کسی زمانے میں بھی اس کے "منت پذیر شانہ گیسوؤں کو سنوارنے" کے خیالات ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئے ہیں ۔ ان کا ایک ایک فرد اپنے اپنے ادبیات کو آسمانوں پر جگمگاتے ہوئے چاند تاروں سے ہم آہنگ کر دینے کے خواب دیکھتا رہا ہے ۔ بڑی سے بڑی چیز بھی اس کے ادبی سرمائے کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی ۔ کیونکہ وہ اس کو اپنی ایک مقدس جاگیر سمجھتا ہے ۔ کیونکہ اس کے نزدیک وہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اس کا صدیوں کا کلچر اور تہذیب ، علم و عمل ، فکر و تدبر اور جذبات و احساسات کی تصویریں بے نقاب نظر آتی ہیں ۔ کیونکہ اس کے اندر اسکو اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تمام روایات کا بسیرا دکھائی دیتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ایک قوم سب کچھ چھوڑ سکتی ہے لیکن اپنے ادب سے علیحدگی یا بے تعلقی اختیار نہیں کر سکتی ۔ انگریزوں کے متعلق تو یہ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اس سلطنت کو خیرباد کہہ سکتا ہے جس میں سورج غروب نہیں ہوتا ۔ لیکن اگر ان سے کوئی کہے کہ "شیکسپیئر کو چھوڑ دو" تو وہ اس کیلئے ہرگز تیار نہیں ہونگے ۔ سلطنت کو خیرباد کہہ دینا انہیں منظور ہوگا ۔

لیکن دنیا کی ان قوموں کے دوش بدوش ایک بدقسمت قوم ایسی بھی بستی ہے جس نے اپنے ادب کو ہمیشہ کس مپرسی اور زبوں حالی کے ایسے گڑھے میں ڈالے رکھا جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی ۔ اس کے ادب کی چشمِ حسرت ہمیشہ سے اس کی طرف ٹکٹکی باندھے تکتی رہی ۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا ۔ اس کی آرزوئیں اور تمنائیں ، ارمان اور خواہشیں اپنی قوم کے ایک ایک فرد کی طرف دستِ طلب دراز کرتی رہیں ۔ لیکن انکی بے نیازیوں نے اس کی طرف نگاہِ نیم باز ڈالنے کی بھی زحمت گوارا نہ کرنے دی ۔ میرا مطلب اردو داں قوم سے ہے ۔ اور جس میں ہندو ، مسلمان اور سکھ سب ہی شامل ہیں ۔ ہمارا ، ادب میرا اور آپ کا اور ان سب کا شکوہ سنج ہے ۔ ہم سب نے وقتاً فوقتاً اس سے دلچسپی کا اظہار کیا ہے ۔ اس سے محبت کی ہے ۔ اس کو بنانے اور سنوارنے کے بلند بانگ دعوے کئے ہیں ۔ لیکن بالکل اسی طرح جیسے کوئی شخص کسی داشتہ سے ۔ کوئی ہوس پرست کسی پیشہ ور عورت سے ۔ اہم اس طرح خلوص اور انہماک کے ساتھ اس سے دلچسپی کا اظہار نہیں کر سکے ہیں جیسے کوئی انسان اپنی بیوی سے کرتا ہے ۔ اور یہ ہماری زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے ۔ ایک قوم کی زندگی کا سب سے زیادہ تاریک اور گھناؤنا پہلو ہے ۔ چنانچہ اس پر جس قدر بھی آنسو بہائے جائیں کم ہیں ۔

ہماری زندگی کے چہرے پر یہ بدنما داغ آج ہی نہیں لگا ہے ۔ یہ موجودہ نسل ہی کی بے نیازی کا نتیجہ نہیں ہے ۔ بلکہ جس روز سے اردو ادب نے آنکھ کھولی ، اسی روز سے یہی حال ہے ۔ اردو ادب سے یہ بے نیازی ہمارے آباؤ اجداد کی "میراث" ہے ۔ ہم سے پہلے بھی اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی ۔ اس نے جنم اس وقت لیا جب فضا میں چاروں طرف فارسی کے نغمے

گوشے ہوئے تھے۔ اور ہر شخص ان کا والہ و شیدا تھا۔ حکومت کی ہمدردیاں اور دلچسپیاں فارسی ہی کے ساتھ تھیں۔ بڑے بڑے شاعر اردو میں شعر کہنا اپنے شایانِ شان نہیں سمجھتے تھے۔ اگر کبھی اس زبان میں طبع آزمائی کرتے تھے تو محض "تفننِ طبع" کے طور پر! ظاہر ہے ان حالات میں ادب صرف عوام کے سہارے تو آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غدر سے قبل جو کچھ فارسی ادب کے لئے ہوا یا کیا گیا۔ اس کا عشرِ عشیر بھی اردو ادب کے لئے نہ ہو سکا۔ البتہ غدر کے بعد دنیا بدل گئی۔ اب خود لوگوں نے اسے اپنے کام کا ذریعہ بنانا چاہا۔ چنانچہ وہ بنا۔ لیکن باوجود اصلاحی، علمی اور تعلیمی تحریکوں کے کوئی ایسی فضا اس وقت بھی پیدا نہ ہو سکی جو سماج کے افراد کی آتشِ شوق کو بھڑکاتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمانے میں خاصے ادبی کارنامے پیش کئے گئے۔ بہت سی تخلیقات کے ستارے آسمانِ ادب پر طلوع ہوئے، لیکن جہاں تک عوام کے ذوق و شوق کا تعلق ہے اس میں اندھیرا ہی رہا۔ یہ اندھیرا آج بھی موجود ہے، لیکن پھر بھی موجودہ نسل نے بڑی حد تک اردو ادب کے آنسو پونچھنے کی کوشش کی ہے۔ جس کی وجہ سے کچھ سنبھلی ہوئی کیفیت ضرور نظر آتی ہے، اور "بیمار" کا حال کسی قدر اچھا ضرور معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ تو کسی کے دیکھنے سے رونق آجانے والی کیفیت ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بیمار کا حال اچھا نہیں۔

اردو ادب کی صورت حال کیا ہے؟ —— اس پر ہم لوگوں میں سے اکثر نے شاید ہی کبھی غور کرنے کی زحمت گوارا کی ہو۔ ہماری زندگی کا عجیب حال ہے کہ ہم حقیقتوں سے جی چراتے، اور خیالی دنیا کی ہواؤں میں بسیرا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان پر غور کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اور جو کچھ ہمیں کرنا چاہئے وہ نذرِ "طاقِ نسیاں" ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم آگے نہیں بڑھ پاتے "قطب از جا نمی جنبد" کا مصداق بن جاتے ہیں۔

بہر حال تو میں آپ سے اردو ادب کی موجودہ صورت حال پر کچھ باتیں کرنی چاہتا ہوں۔ اسکی موجودہ صورتِ حال سے اسکے فکری یا فنی پہلو کا جائزہ مقصود نہیں، بلکہ اردو داں قوم نے اسکے ساتھ کیا کیا ہے؟۔ اور اس کی وجہ سے اس کی جو حالت ہو گئی ہے۔ اور آئندہ اس کی وجہ سے جو کچھ ہونے والا ہے، میں اس کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ اردو ادب کے پڑھنے والے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کا اندازہ آپ اس سے لگائیے کہ اردو ادب کی معیاری سے معیاری کتاب کا پہلا اڈیشن عام طور پر ایک ہزار سے زیادہ نہیں چھپتا۔ اور بعض کتابیں تو پانچ سو تک چھاپی جاتی ہیں۔ دوسرے اڈیشن کے شائع ہونے کی نوبت کم ہی آتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اردو کی کتابیں زیادہ سے زیادہ چند ہزار لوگوں کی نظروں سے گزرتی ہیں۔ اور یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ ظاہر ہے جب کتاب ہی ہزار یا پانسو سے زیادہ نہیں شائع ہوگی تو زیادہ لوگوں کے پڑھنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یہ بات میں اردو ادب کی نشر و اشاعت کی عام حالت کو سامنے رکھ کر کہہ رہا ہوں۔ ورنہ اردو میں بعض بعض کتابوں کے کئی کئی اڈیشن بھی شائع ہوتے ہیں۔ اور وہ ہزاروں کی تعداد میں بکتی بھی ہیں۔ مثال کے طور پر علامہ اقبالؒ کی کتابیں! یا ایک حد تک جوشؔ ملیح آبادی کے کلام کے مجموعے! لیکن انہیں مستثنیات میں سے سمجھنا چاہئے۔

یہ صورت حال حد درجہ افسوس ناک ہے لیکن اس پر افسوس کرنے کی بجائے یہ ضروری ہے کہ ہم آپ سر جوڑ کر اسکے اسباب پر غور کریں۔ کیونکہ اگر یہ صورت باقی رہتی ہے تو کم از کم موجودہ طوفانی فضا میں تو اردو ادب کا زندہ رہنا یا ترقی کرنا مشکل ہے۔

اردو ادب کی کتابوں کی اس قدر کم اشاعت ہونے کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ اسکے پڑھنے والے کم ہیں۔ اور پڑھنے والوں کے کم ہونے کی وجہ اردو والوں میں ادبی ذوق کا فقدان ہے۔ ادبی ذوق کا فقدان ہونے کا سبب وہ عام فضا ہے جس میں

ہماری زندگی صدیوں سے گھری ہوئی ہے۔ ہمارے یہاں صحیح قسم کی تعلیم کا نام و نشان نہیں۔ لوگ تعلیم حاصل کرتے ہیں لیکن اس کا مقصد اپنے اندر علمی و ادبی صلاحیتوں کو بیدار کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ صرف تعلیم حاصل کرنے کی خاطر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے اپنے ایک پروفیسر کا یہ جملہ آج تک نہیں بھولا، جو ہندوستان کے ناقص نظامِ تعلیم سے اکتا کر اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ "ہم صرف بھولنے کیلئے پڑھتے ہیں: WE READ TO FORGET" تعلیم حاصل کرنے کا مقصد کوئی علمی و ادبی کام کرنا نہیں ہوتا، بلکہ اگر کوئی مقصد اس کا ہوتا ہے، تو وہ روزی کمانا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی حد تک اقتصادی اور معاشی اقدار کی ناہمواری کا بھی نتیجہ ہے لیکن اسکی تشکیل میں زندگی کے غلط نظریات بھی اثر انداز ہوئے ہیں۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو اعلٰے سے اعلٰے تعلیم حاصل کرنے کے بعد کتاب دیکھنا ایک خلافِ فطرت فعل سمجھتے ہیں۔ اور اگر انہیں کوئی ایسا کرتا ہوا نظر آتا ہے تو وہ اسکے اس عمل کو اس کے خلل دماغ پر محمول کرتے ہیں۔ انکے نزدیک پڑھنے لکھنے کیلئے زندگی کو وقف کر دینا سب سے بڑی بدمذاقی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں ادب کی جو تعلیم ابتدا سے شروع ہوتی ہے، اس میں کسی باقاعدگی اور معقولیت کو دخل نہیں ہوتا۔ ادب کی تعلیم دینے والے ایسے لوگ ہوتے ہیں جو خود ادب سے کوئی مس نہیں رکھتے۔ ان کی صحبت میں دو چار سال جو طالب علم بسر کرتا ہے اس کو ادب سے کوئی نسبت پیدا ہونے کے بجائے نفرت ہو جاتی ہے۔ اور یہ نقش اس کے ذہن اور دل و دماغ پر ایسا ثبت ہوتا ہے کہ زندگی بھر نہیں مٹتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بہت سے تعلیم یافتہ ادبیات کی مختلف اصناف کے مطالعہ کو محض تفنیعِ اوقات سمجھتے ہیں۔ جب تعلیم یافتہ افراد کا یہ حال ہو تو پھر غیر تعلیم یافتہ لوگوں کا تو خیر کہنا ہی کیا۔ اور پھر تعلیم ہمارے یہاں ہے ہی کتنی؟ بہت کم لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ حد آٹھ یا دس فیصدی ہے۔ اس کے علاوہ جن لوگوں کو تھوڑی بہت دلچسپی ہے، انہوں نے اپنی یہ عادت ڈال لی ہے اور شعار بنا لیا ہے کہ اردو کی کتاب خرید کر نہیں پڑھینگے۔ کسی کتب خانے سے حاصل کر لیں گے۔ کسی دوست سے مستعار لے لیں گے۔ کتاب خرید کر پڑھنا اور اس کو اپنے پاس محفوظ رکھنا ان کے خیال میں بھی نہیں آتا۔ میں پنجاب اور دوسرے صوبوں کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا، کیونکہ میں نے سنا ہے کہ وہاں کے لوگ کتابیں خریدنے میں کم از کم یوپی کے مقابلے میں بہت آگے ہیں۔ لیکن یوپی میں تو حالت غیر ہے۔ یہاں اول تو لوگ پڑھتے ہی نہیں، اور جو پڑھتے ہیں انکے نزدیک خرید کر پڑھنا جائز نہیں۔ آپ جدھر جائیں گے ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھا ہوا نظر آئے گا۔ اس نے ادب کے سیاسی رجحان کے متعلق کچھ نہ پڑھا ہو گا۔ اسے مصنف اور کتابوں کے نام تک نہ معلوم ہونگے۔ اگر وہ شاعر ہوگا تو وہ اپنے آپ اور اپنے شاگردوں کے علاوہ دوسروں کو بہت کم جانتا ہوگا۔ اگر اس سے کوئی پوچھے گا کہ صاحب! آپ جدید ادب کے فلاں رجحان سے بھی واقف ہیں، تو ارشاد فرمائیں گے "حضرت! اردو ادب تباہ ہو رہا ہے، زبان کو تو ان نئے لکھنے والوں نے تباہ کر ہی دیا تھا، اب ادب اور فن پر بھی حملے ہو رہے ہیں۔ میں ان خرافات کو دیکھ کر بھلا اپنا وقت کیوں خراب کروں ——" ان تمام باتوں کا نتیجہ آپ کو معلوم ہے کیا ہو رہا ہے۔ یوپی میں اردو زبان اور ادب والے خود اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ کر ہلاک کر رہے ہیں۔ یہاں نہ کتابیں شائع ہوتی ہیں اور نہ رسالے نکلتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسی چیز کو معیار بنا کر ریڈیو میں اردو کو صرف دس فیصدی نمائندگی دی جاتی ہے —— لیکن حیرت تو یہ ہے کہ یہاں کے لوگ ابھی تک سو رہے ہیں۔ اور اب تو یہ امکان سا ہو گیا ہے کہ سوتے ہی رہ جائیں گے۔ پنجاب کی مدد شاملِ حال نہ ہوتی تو اردو کی ان کتابوں اور رسالوں کا بھی پتہ نہ چلتا جو آج دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ دعوٰے ہے کہ ہم اہلِ زبان ہیں۔ اردو ہماری زبان ہے۔ کسی سے کہئے کہ صاحب اردو ادب کی بقا کے لئے کچھ سوچئے!

تو ارشاد ہوگا "ہم اہل زبان اور اہل ادب ہیں، اردو ادب کو ہمارے سامنے کون نقصان پہنچا سکتا ہے۔ سلور پھر زبان اور ادب کی بقا کے لئے بھی کچھ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے صاحب! لکھنؤ والے زندہ ہیں۔ گفتگو اور بات چیت میں ادب پیش کرتے ہیں۔" اور اس ذہنیت کے نتائج جو کچھ ہو رہے ہیں، اور جو کچھ آئندہ ہونے والے ہیں اس کا تصور کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسی ذہنیت نے کم از کم یوپی میں اردو کا جنازہ نکالنے کی پوری تیاری کر دی ہے۔ کاش اب بھی یہاں کے لوگوں کو خصوصاً اور اردو والوں کو عموماً ہوش آجائے، اور جن بھیانک راستوں سے وہ گزر رہے ہیں اس کا ان کو احساس ہوجائے!

اردو ادب کو اگر زندہ رکھنا، ترقی دینا اور آگے بڑھانا ہے تو اس قسم کی ذہنیتوں کو فنا کرنا ہوگا۔ تعلیم عام کرنی ہوگی۔ اور مروجہ نظامِ تعلیم کے نقشے میں نئے رنگ بھرنے پڑینگے۔ ایک ایک فرد کے دل میں ادبی ذوق کی شمعوں کا روشن کرنا ضروری ہوگا۔ بیشمار انجمنیں بنانی ہونگی جو اس کام کو انجام دے سکیں۔ اگر ایسا ہوا تو اردو ادب کے پھیلنے اور بڑھنے کے امکانات پیدا ہوسکتے ہیں۔ ورنہ مخالفت، نفرت، اور تلخی بغض کے ان طوفانوں میں اس کے پھیلنے اور بڑھنے کے متعلق سوچنا تو درکنار، زندہ رکھنے کی صورت نکالنی بھی "جوئے شیر" کے "لانے" سے کم مشکل نہ ہوگی۔

موجودہ دور میں وطنِ عزیز کا پورا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں، اور ہمارا احساس اس خیال سے گھائل ہوجاتا ہے کہ خواہ مخواہ کی نفرت اور انتقام کے ناگ اُسے ڈس لینے کے درپے ہیں۔ اگر ہم اس وقت بھی نہ جاگے "اہل زبان" یا "اہل ادب" کی مصنوعی قبائیں اوڑھ کر خیالوں کی دنیاؤں میں بسیرا لیتے رہے تو اس کا اللہ ہی مالک ہے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے اپنے گھروں میں ادبی فضا قائم کی جائے۔ اردو قدیم اور جدید ادب کی معیاری کتابیں ہر اردو داں فرد کے گھر میں موجود ہوں، اور ان کو پڑھا جائے۔ ماؤں اور بہنوں، بچوں اور بچیوں کو اسی طرح پڑھایا جائے کہ وہ اس سے دلچسپی لیں۔ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے حلقے قائم کئے جائیں جن میں اردو زبان اور ادب کی اہمیت پر تقریریں ہوں۔ مشاعروں کا سلسلہ جاری ہو۔ کتب خانے قائم کئے جائیں۔ تمام افراد کو اردو کی کتابیں خریدنے کی طرف راغب کیا جائے، اردو ادب کے مدارس شبینہ کھولے جائیں۔ اپنی اپنی حکومتوں سے درخواست کی جائے کہ وہ اردو ادب کی ترقی کے کاموں میں مدد کریں۔ دھن دولت والوں کو اس طرف راغب کیا جائے کہ وہ اردو ادب کی اشاعت کے کاروبار میں روپیہ لگائیں۔ اگر ایسا ہوا تو حالات بدل سکتے ہیں۔ ورنہ صورت حال تو کچھ ایسی ہے جو زبان حال سے یہ کہہ رہی ہے کہ ؂

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

فراق گورکھپوری

غزل

قلوب نور کے سانچے میں ڈھلتے جاتے ہیں چراغ تیرے تبسّم کے جلتے جاتے ہیں
زمیں کی کوکھ ہے یا لہلہاتی جنّت ہے حیاتِ تازہ کے چشمے اُبلتے جاتے ہیں
کبھی زمانے کو دیں گے وہی نویدِ بہار جو اپنے منہ پہ لہو اپنا ملتے جاتے ہیں
کبھی نشاط بھی ہو جائے گی عذاب انہیں ابھی تو غم سے ترے دل بہلتے جاتے ہیں
انہیں جہان کی تفسیر کی کہاں فرصت عمل سے اپنے جو دُنیا بدلتے جاتے ہیں
وُہ جن کے پاس بجز نام کے کچھ اور نہیں انہیں کے نام سُنا ہے اچھلتے جاتے ہیں
کہیں نہ اپنی ہی پرچھائیوں سے ڈر جائیں وہ جن کی رہ سے کہستان ٹلتے جاتے ہیں
گلے پڑی اب اسیرو، بلا سے آزادی پرانے طوق و سلاسل بدلتے جاتے ہیں
وُہ کاروانِ جنوں خاک و خوں میں لپٹے ہوئے جو آسمانوں کے بھی سر کچلتے جاتے ہیں

نوائے نیم شبی سے نکل رہی ہے فراق
وُہ آنچ جس سے ستارے پگھلتے جاتے ہیں

کرشن چندر

دوسری موت

شیواجی پارک بمبئی کے مضافات میں ہے اور اس کے قابل دید مقامات میں ہے۔ گو شروع میں یہ بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتی کہ یہاں کی کونسی شے قابلِ دید ہے۔ عمارتیں؟ عمارتیں تو بمبئی میں چاروں طرف ہیں۔ نفیس فلیٹ؟ تو وہ میرین ڈرائیو پر جا کر دیکھئے۔ جہاں ایک فلیٹ کے لئے پچیس ہزار روپے کی پگڑی دینی پڑتی ہے۔ ناریل کے درخت؟ تو وہ جوہو پر ہزاروں کی تعداد میں نظر آئیں گے۔ شیواجی پارک میں تو خال خال ہی نظر آتے ہیں، سمندر؟ بھئی سمندر تو بمبئی کے چاروں طرف ہے۔ اس میں شیواجی پارک ہی کو کیا خصوصیت ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اسے اس قدر قابل دید مقام کیوں سمجھا گیا ہے۔

دراصل یہ بات اتنی جلدی سمجھ میں آنے والی نہیں۔ اس کے لئے شیواجی پارک میں رہنا بہت ضروری ہے اور کوئی دو چار مہینے رہنے سے کام نہ چلے گا۔ برسوں کی مستقل رہائش چاہئے۔ جب جا کے اس کی قابل دید وشنید خصوصیات کا پتہ چل سکے گا مثال کے طور پر مجھے اقامت کے پہلے چھ ماہ میں یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ میرے فلیٹ کے بالکل اوپر دوسرے فلیٹ میں شراب کی بھٹی ہے۔ مسٹر رومولو جو اوپر کے فلیٹ میں رہتے تھے۔ ایک ماہر بٹن ساز تھے اور ایک سندھی کارخانے دار کی بٹن فیکٹری میں ملازم تھے جب وہ پکڑے گئے تو اچانک ہی ہمیں پتہ چلا کہ صرف ایک ماہر بٹن ساز ہی نہ تھے، ماہر شراب ہی تھے۔ اُن کی بھٹی کی کشید شدہ شراب۔ ذائقے۔ رنگت اور تاثر میں مشہور فرانسیسی شرابوں کو بھی مات کرتی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ ہمیں بعد میں معلوم ہوا۔ پہلے چھ ماہ تک تو ہم انہیں بٹن سازی کا ماہر سمجھتے رہے۔ مسٹر رومولو بڑے ملنسار ہنس مکھ انسان تھے۔ اکثر اترتے چڑھتے بلڈنگ کی سیڑھیوں پر ان سے ملاقات ہوتی تھی اور کئی کئی منٹ حیدرآباد کے بٹن اور کانپور کے چمڑے کے بٹنوں پر اُن سے گفتگو رہتی تھی اور پھر نام کتنا اچھا تھا۔ رومولو۔ . . رومولو۔ . . . زبان پر کس نفاست سے گھومتا ہے۔ رومولو۔ رومولو کتنی گھلاوٹ ہے اس نام میں۔ لکھنؤ کی بالائی کا سا مزا آتا ہے۔ اور ایک اسی شیواجی پارک میں میرے دوست رہتے ہیں۔ نام ہے خواجہ مشہد بناض۔ نام سن کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی گھوڑا کچے شلغم چبا رہا ہے۔ بھلا آپ ہی بتائیے۔ ایسے نام کا آدمی دُنیا میں ترقی کر سکتا ہے۔ خیر تو ذکر مسٹر رومولو کا ہو رہا تھا۔ جب وہ ناجائز شراب سازی کے جرم میں دھر لئے گئے تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میرے ایک اور دوست ہیں جو اسی بلڈنگ میں رہتے تھے۔ دس سال فرانس میں رہ کے آئے تھے۔ بڑے خوش ذوق آدمی تھے۔ موٹر گاڑی بھی رکھتے تھے۔ کبھی کبھار جب میرے رشتہ دار گاؤں سے بمبئی کی سیر کے لئے آتے تو میں اُن سے گاڑی مانگ لیتا تھا۔ وہ امپورٹ اور ایکسپورٹ کے تاجر تھے اور فیروز شاہ مہتہ روڈ پر ان کا دفتر تھا۔ مسٹر رومولو کی گرفتاری پر ہنس کے فرمانے لگے "بھئی کچھ بھی ہو رومولو برانڈ کی شراب کا جواب بمبئی میں نہیں ہے۔ اسے چکھ کر پیرس کی گلیاں یاد آجاتی ہیں اور فرانسیسی کنواری کا جسم، جو اب خود پیرس میں نایاب ہوتا جا رہا ہے۔ آنکھوں کے آگے گھومنے لگتا ہے، مگر"۔ میں نے اپنے دوست سے کہا "میں تو سمجھا تھا کہ یہ بٹن . . . ."

انہوں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا: "تم تو نرے چغد ہو۔ ارے میاں یہ شیواجی پارک ہے۔ یہاں ہر آدمی دو کام ضرور کرتا ہے۔ ایک سفید مارکیٹ کا ایک بلیک مارکیٹ کا۔ سفید مارکیٹ میں پیسہ نہیں ہے۔ پیسہ تو صرف بلیک مارکیٹ سے ملتا ہے۔ مسٹر رو مولو کی شراب ملبار ہل پر جاتی تھی۔ بڑے بڑے امیر گھرانوں میں۔ خود بمبئی کے پولیس کمشنر نے اکثر دعوتوں میں اس شراب کو چکھا ہے۔ کیا بات کرتے ہو؟"

جب پولیس مسٹر رو مولو کو لے گئی تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ میرے دوست کہنے لگے: "اماں کیوں افسوس کرتے ہو؟ وہ بڑا پرفن اور کائیاں ہے۔ دور تک اُس کی پہنچ ہے۔ دیکھنا بہت جلد چھوٹ جائے گا اور یہی ہوا۔ چند دنوں میں میں نے مسٹر رو مولو کو ہنستے کھیلتے واپس آتے دیکھا۔ مگر اب وہ شیواجی پارک کا فلیٹ تبدیل کر رہے تھے۔ دس ہزار روپیہ پگڑی پر اُنہوں نے اپنا فلیٹ ایک سندھی شرنارتھی کو دے دیا جو بیچارہ کراچی سے اپنی جان بچا کے بمبئی بھاگ آیا تھا۔ اُسے اپنے والمیشین کتے کا بڑا افسوس تھا جو کراچی میں ہی رہ گیا تھا۔ بیوی بچے زیور دولت سب کچھ وہ لے آیا تھا مگر اس کے مکانات اس کا کارخانہ اور اس کا باغ وہیں رہ گیا مگر ان چیزوں کا اسے اتنا افسوس نہ تھا۔ جتنا اس کے والمیشین کتے کا جو غلطی سے کراچی میں رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے مسلمان دوستوں کو کئی تار دیئے۔ لیکن وہ لوگ اتنے کٹر پاکستانی تھے کہ انہوں نے بے چارے کا کتا وہیں رکھ لیا۔ بڑا خوبصورت کتا تھا وہ، سپید براق جلد پر چتلے چتلے داغ، جیسے نئے فیشن کی ساڑھیاں نہیں ہوتی ہیں۔ بس اس کا پیارا والمیشین بھی اسی ڈیزائن کا تھا۔ ظالم پاکستانیوں نے ہتیا لیا اور ہماری سرکار ہے کہ ایسے شرنارتھیوں کے لئے کچھ بھی نہیں کرتی!

یہ بات کہ شیواجی پارک میں ہر آدمی دو کام کرتا ہے۔ مجھے جچی نہیں۔ اور جچی تھی اس وقت جب میرے دوست خود لڑکیوں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں پکڑے گئے۔ بعد میں یہ راز کھلا کہ ان کا امپورٹ اور ایکسپورٹ کا دفتر بھی جو فیروز شاہ مہتا روڈ پر تھا۔ دراصل لڑکیوں کی امپورٹ اور ایکسپورٹ کا کام کرتا تھا۔ یہ کام غریب پنجابی شرنارتھیوں کی آمد سے اور بھی بڑھ گیا تھا۔ انہی دنوں میرے دوست نے اک نئی ڈیملر خریدی تھی اور اس میں اکثر خوبصورت لڑکیوں کو ڈرائیو کے لئے لے جایا کرتے تھے مگر وہ لڑکیاں تو اتنی فیشن ایبل تھیں کہ مجھے کبھی اندازہ ہی نہیں ہوا کہ ان کی بھی امپورٹ ایکسپورٹ ہوتی ہے۔ اس قدر ہائی کوالٹی کا مال ہوتا تھا کہ پولیس کی نگاہ بھی چوک جاتی تھی اور پھر بڑے بڑے دوست تھے میرے دوست کے، ان کے فلیٹ میں میری ملاقات نواب آغر گھسیارہ کے ساتھ ہوئی۔ مسٹر جی حضوری سے ہوئی۔ مولانا شرف اللہ سے ہوئی۔ سیٹھ دپت چاو ڈیا سے ہوئی۔ کیا لوگ تھے وہ۔ ہر ایک کے پاس پندرہ بیس بلڈنگیں، آٹھ دس گاڑیاں۔ پانچ سات داشتائیں اور دو چار سیاسی لیڈر نوکر تھے اور جب میں اپنے دوست سے کہتا: "بھئی تم بڑے بارسوخ ہو۔ ایک بزنس ہمیں بھی کرا دو۔" تو اپنے موٹے سگار کی راکھ جھاڑ کر کہتے: "ارے بھئی تم کیا جانو۔ اس بزنس میں کتنی پریشانی ہے۔" اب پتہ چلا۔ جب پولیس انہیں گرفتار کر کے لے گئی کہ اس میں کتنی پریشانی ہے۔ سنا ہے لڑکی جو ایکسپورٹ کی گئی۔ صرف تیرہ سال کی تھی۔ اس کے ماں باپ نے اسے پندرہ سو میں بیچ دیا تھا۔ میرے دوست نے۔ اسے ایک ریاست میں سات ہزار روپے پر ایکسپورٹ کر دیا۔ کسی نے بیچ میں کمیشن زیادہ مانگا اور میرے دوست نے نہیں دیا۔ اس نے پولیس میں اطلاع کر دی اور آپ جانئے پولیس تو ایسے معاملوں کی تاک میں رہتی ہے۔ بے چارے شریف آدمی کو گرفتار کر لیا۔

ایسے واقعات شیواجی پارک میں ہوتے رہتے ہیں۔ میرا ایک دوست تھا بھنڈاری۔ بیچارہ کراچی سے بزنس

کے لئے آیا تھا۔ یہاں ایک گجراتی لڑکی سے عشق کر بیٹھا اور بزنس کے بجائے اُس نے ایک روز لڑکی کی بے مہری سے تنگ آکر زہر کھالیا۔ آپ اس لڑکی کو دیکھیں تو کہیں اس لڑکی کے لئے زہر تو کیا مٹھائی بھی نہیں کھائی جاسکتی مگر دل ہی تو ہے۔

شیواجی پارک میں کارخانے دار رہتے ہیں اور کرخندار بھی۔ سیٹھ لوگ بھی اور سیٹھوں کے غلام بھی۔ کہیں کہیں فلم ایکٹرس بھی نظر آجاتے ہیں: "وہ گھر دیکھا تم نے، یہاں شری گھوش رہتے ہیں۔"

"شری گھوش! پرچ مُچ؟"

"ہاں۔"

"وہی شری گھوش جنہوں نے جڑی کا یکہ اور چور کا موڑ اور گوبھی کے پھول میں کام کیا ہے؟"

"ہاں۔"

"کمال ہے بھئی۔ یہ چھوٹا سا مکان اُن کا ہے۔"

"اور وہ جو مکان ہے۔ جس کے باہر بھنگن جھاڑو دے رہی ہے۔ وہاں مس دمساز لانتی رہتی ہے۔"

"دمساز لعنتی!"

"لعنتی نہیں۔ لانتی ہے۔ عین غائب ہے۔"

"دمساز لانتی، جھوٹ تو نہیں بولتے۔ وہی دمساز لانتی جو بدقسمت، من کی پھوار اور میں کیسے بکوں کی ہیروئن ہے۔"

"وہی وہی!"

"بھئی یقین نہیں آتا۔ اتنی بڑی ہیروئن یہاں رہتی ہے۔"

"یقین نہ آتا ہو تو اس بھنگن سے پوچھ لو۔"

"کمال کردیا بھئی۔"

"کیا سمجھتے ہو۔ یہ شیواجی پارک ہے۔" میرا گائیڈ جواب دیتا ہے۔

اب مجھے یہاں رہتے ہوئے چھ سال ہو گئے ہیں۔ اب میں کہہ سکتا ہوں کہ شیواجی پارک واقعی قابلِ دید جگہ ہے۔ یہاں فلم انڈسٹری کے بہترین ہیرو اور ہیروئن موجود ہیں۔ بڑے بڑے سیٹھ اور کارخانے دار۔ اخباروں کے مالک اور بڑے بڑے جرنلسٹ جن کے قلم کا لوہا دنیا مانتی ہے اور پھر معمولی لوگ بھی رہتے ہیں۔ دھوبی۔ نائی۔ کلرک۔ ادیب۔ مٹھائی بیچنے والے کنجڑے ڈرائیور، ویٹر، پان والے، پھول والے، ناریل والے، دہی بڑے کی چاٹ والے معمولی لوگ۔ جس میں طوائفیں بھی شامل ہیں۔ شیواجی پارک دوسری الشاق آبادیوں کی طرح ہی ایک اور آبادی ہے۔ اس آبادی میں ہندو زیادہ ہیں مسلمان کم۔ یوں سمجھئے کہ سو میں سے پچانوے تو ہندو ہوں گے اور پانچ مسلمان۔ ہندوؤں میں ستر مرہٹے ہوں گے اور بیس گجراتی۔ باقی پانچ فلم ایکٹر سمجھئے۔ مرہٹے بالعموم متوسط یا نچلے متوسط طبقے کی اولاد ہیں۔ گجراتی امرا کے طبقے میں قدم رکھتے ہیں اور جو فلم ایکٹر ہیں سو وہ ان دونوں طبقوں کے بیچ میں گزرتے رہتے ہیں۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ جنگ کے زمانے میں یہ لوگ لاکھوں کماتے تھے۔ جنگ کے بعد لاکھوں گنوا دیئے انہوں نے۔ آج کل بیکاری کے زمانے میں ہندو سیوک سنگھ میں نام لکھا لیا ہے اور ہندو دھرم سے عشق کرتے رہتے ہیں۔ جنگ کے زمانے میں رنڈیوں سے عشق کرتے تھے۔ کبھی کبھی غور کرتا ہوں تو اپنی ساری زندگی بھی۔ شخصی۔ قومی زندگی۔ امپورٹ اکسپورٹ کے اصول پر چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے!

شیواجی پارک میں سبھی طرح کے لوگ ہیں مگر پھر بھی عرصہ چھ سال سے دیکھ رہا ہوں کہ لوگ اپنے فلیٹوں میں آرام سے رہتے ہوں یا دکھ سے رہتے ہوں۔ شرافت سے ضرور رہتے ہیں۔ کیونکہ انسانی برادری کے ہزاروں فساد و فتنہ گردی کے اصول پر کسی آبادی کو زیادہ دیر تک نہیں چلا سکتے۔ اس لئے بچے آسانی سے گلیوں میں گھومتے ہیں۔ عورتیں آزادی سے پارک میں سیر کرتی ہیں۔ دکانوں پر سودا سلف خریدتی ہیں۔ مرد دفتروں کارخانوں اور دکانوں پر کام کرتے ہیں اور شام کو ایک قمیص اور دھوتی پہنے ہوئے سمندر کے کنارے آجاتے ہیں اور گپ اڑاتے ہیں۔ ننھے ننھے کھلونوں کی ننھی ننھی حرکات اور قریب ہی سمندر کی گمبھیر گرج گونج چاروں پہر سنائی دیتی ہے اور چھوٹی چھوٹی انسانی مسرتوں کے لئے پس منظر موسیقی کا کام دیتی ہے۔ کبھی موسیقی ہے تو کبھی گرج ہے۔ کبھی خطرہ ہے تو کبھی خوشی ہے۔ سمندر کی گونج ہر آن انسانی خوشیوں اور دکھوں کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور شیواجی پارک کی انسانی آبادی اس گونج میں اپنے ڈھنگ کے سُر ڈھونڈتی رہتی ہے۔

(۲)

میری اقامت کے چھٹے سال شیواجی پارک میں ایک طوفان اٹھا۔ یہ طوفان بہت دور سے آیا تھا۔ گو سمندر شیواجی پارک کے قریب ہے۔ لیکن یہ طوفان اس سمندر میں نہیں آیا تھا۔ یہ طوفان بہت دور سے، آج سے ایک سو سال دور پیچھے سے آیا تھا۔ یہ طوفان غدر سے شروع ہوا اور پندرہ اگست کو سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ انسانی تاریخ کے اس طوفان نے ہر ہندوستانی گھر کی چولیں ہلا دیں اور کہیں نہ کہیں اس کی روح میں، اس کے جسم میں، اس کے ذہن میں، اس کے آداب میں، اس کی زندگی میں کوئی نہ کوئی انقلاب ضرور پیدا کر دیا۔ یہ بڑا بھاری طوفان تھا جو صدیوں کے بعد ہی انسانی زندگی میں آتا ہے تو اسے شروع ہوئے ایک سو سال سے زیادہ عرصہ ہوا تھا۔ کئی لوگ کہتے ہیں کہ یہ ایک طوفان نہ تھا۔ دو طوفانوں کی ٹکر تھی۔ ایک طوفان جو ایک سو سال پہلے شروع ہوا اور دوسرا طوفان جو اس سے کہیں پہلے منوسمرتی کی جارحانہ براہمنیت سے شروع ہوا۔ سینکڑوں سال پہلے وہ براہمنیت جو بدھ کے عروج کا باعث بنی۔ جس نے اسلام کو فروغ دیا جس نے اچھوت پیدا کئے۔ آج پاکستان کو جنم دے رہی تھی۔ بلاشبہ یہ دو طوفانوں کی ٹکر تھی۔ قومیت کا سیلاب اور براہمنیت کا ردِ عمل۔ قومیت کا سیلاب آزادی لایا۔ براہمنیت کے ردِ عمل نے پاکستان کی تشکیل کی اور اب دونوں طوفان ٹکرا رہے تھے۔ بجلی کی کڑک، رعد، گونج، گرج، انسانی چیخیں، خون کی لہریں، بجلی جو گھروں کو جلا گئی، عصمتوں کو جلا گئی۔ کھیتوں کو جلا گئی۔ انسانوں کو جلا گئی۔ یہ طوفان ادھر سے آیا۔ جدھر سے آریہ لوگ آج سے ہزار سال پہلے ہند میں داخل ہوئے تھے۔

سردار دوہتر سنگھ اسی طوفان کے ریلے میں بہتا بہتا شیواجی پارک آ نکلا تھا۔ دوہتر سنگھ لائل پور کا ہٹا کٹا کسان تھا۔ جسم و جان کا مضبوط۔ اس کے آباؤ اجداد نے لائل پور کی بنجر زمین میں اپنی محنت سے بہار کے پھول اگائے تھے وہ لائل پور کا بوٹا تھا جس طرح وہاں کی گندم، وہاں کی روئی اور وہاں کے پیلو لائلپور کے تھے۔ جب ایک بوٹے کو اس کے جغرافی ماحول، اس کی مخصوص آب و ہوا۔ اس کی زمین سے اکھاڑ دیا جائے تو دوسری جگہ اس کی کاشت مشکل سے ہو سکتی ہے۔ اس معمولی امر کو ہر کسان اچھی طرح سمجھتا ہے۔ ہمارے ملک کے تقسیم کرنے والے تقسیم کے وقت بھول گئے تھے۔ دوہتر سنگھ کے قدم شیواجی پارک میں نہ جمتے تھے۔ اس کی رگیں مرجھانے لگی تھیں۔ وہ تندرست پودا نہ تھا۔ بیمار پودا تھا۔

دوہتر سنگھ کی زمین اس کے پاس نہ تھی۔ اس کی بیوی کو لائل پور کے ایک جانگلی سردار نے اغوا کر لیا تھا۔ اس کی

آنکھوں کے سامنے اور وہ کچھ نہ کرسکا تھا۔ اس کے ماں باپ اس کے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ پھر فوج کی مدد پہنچ گئی اور وہ بچ گیا۔ لیکن کرپان اس کے پہلو میں ہر وقت بے چین رہتی تھی۔ محنت کش کسان، ماہیا اور ہیر گانے والا کسان جنسی مشغول میں غرق رہنے والا کسان خون کا پیاسا بن گیا تھا۔ اس نے آتے ہی جب دیکھا کہ شیواجی پارک میں مسلمان بڑے مزے میں رہتے ہیں تو وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ وہ گلی میں سے گزر رہا تھا کہ اس کی نظر ایک پٹھان پر پڑی جو مس دمساز لائتی فلم اسٹار کے گھر کے باہر کھڑا تھا۔ اسے بلوچی سپاہی یاد آئے جنہوں نے اس کے گاؤں پر حملہ کیا تھا۔ اس نے ستِ سری اکال کا نعرہ بلند کیا اور کرپان نکال کر پٹھان کو وہیں تہ تیغ کر دیا

شیواجی پارک میں ہندو مسلم فساد کی یہ پہلی واردات تھی۔ پولیس تحقیقات کے لئے آئی مگر مجرم کا پتہ نہ چلا۔ اسی رات غنڈوں نے ایک کمیٹی بلائی اور دوہتڑ سنگھ کی پیٹھ ٹھونکی گئی اور فیصلہ کیا گیا کہ شیواجی پارک سے مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے۔ اس کام کے لئے سردار دوہتڑ سنگھ کو سب غنڈوں کا سردار مقرر کیا گیا۔

دوسری رات کو سردار دوہتڑ سنگھ نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے کئی مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ ان میں کئی ایک خود غنڈے تھے اور اس فساد کے شروع ہونے سے پہلے ہندو غنڈوں کے ساتھ رہ کر شہریوں کو بلیک میل کیا کرتے تھے

امجد نے مرتے مرتے کہا: "ارے زندگی بھر تیرا میرا ساتھ رہا ہے۔ یاد ہے جب ہم نے مل کر سیٹھ دلپت کی بے عزتی کی تھی؟ جب سکروان جی پارسی کو سمندر میں ڈبویا تھا؟ جب ایرانی ہوٹل والے کو لوٹا تھا اور آج تو ہم پر ہی تلوار لے کر چڑھ آیا ہے دوست!"

دوہتڑ نے پریشان ہو کر کہا: "کیا کروں دوست! مجبوری ہے۔ ہندو دھرم کا معاملہ آن پڑا ہے۔ ورنہ کوئی بات نہیں تھی۔"

"ستِ سری اکال!" کہہ کر دوہتڑ سنگھ نے امجد کا سر اڑا دیا۔

اگلے روز بہت سے مسلمان شیواجی پارک اور اس کے نواحی علاقوں کو خالی کرنے لگے۔ وہی فلیٹ جو دس ہزار پگڑی پر بھی نہ مل سکتے تھے۔ اب دو دو ہزار روپے پر جانے لگے۔ بلکہ کئی لوگ یوں ہی خالی کرتے گئے۔ موٹریں جو پندرہ سولہ ہزار مالیت کی ہوں گی۔ پندرہ پندرہ سولہ سولہ سو میں بکنے لگیں۔ بجلی کے پنکھے، ریڈیو گرام، ہر گراں شے کے دام کوڑی ہو گئے اور یہ سب سردار دوہتڑ سنگھ کی بروقت رہنمائی کے طفیل تھا۔ اب گجراتی سیٹھ اسے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتے تھے گجراتی سیٹھانیوں نے اس کے گلے میں ہار پہنائے۔ امجد کی خوبصورت مرہٹی بیوی اس نے اپنے ہاں رکھ لی اور اسے امرت چکھا دیا۔ ہر روز شراب کی بوتل اس کے پاس پہنچ جاتی اور سو پچاس روپے بھی۔ اب وہ سیٹھوں کی محفل میں رہتا تھا۔ ان کی موٹروں میں گھومتا تھا اور گلی بازار میں یوں اکڑ کر چلتا تھا جیسے شیواجی پارک کا مالک وہی ہے۔ اب اس کے جسم سے لائل پور کی سوندھی مٹی کی بو نہیں آتی تھی۔ اب اس کے جسم کے ذرے ذرے سے لالچ اور خون کی بو آتی تھی۔ اب اس کی زبان پر ماہیا اور ہیر کے گانے نہیں تھے۔ اب وہ فلموں کے بازاری گیت گاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہل نہیں تھا خنجر تھا۔ وہ دوہتڑ سنگھ مر گیا تھا جو لائل پور کا کسان تھا۔ وہ دوہتڑ سنگھ زندہ تھا جسے دو طوفانوں نے جنم دیا تھا۔ اب وہ ہندو دھرم کی عزت کا محافظ تھا اور جن لوگوں نے اس کے ذریعہ فلیٹ حاصل کئے تھے اور موٹریں اور پھر انہیں بازاروں میں ہزاروں کے منافع پر بیچا تھا۔ اس کے قدموں میں بچھے جاتے تھے اور اس کی آؤ بھگت دیوتاؤں کی طرح کرتے تھے

اب یہ طوفان بھی گزر چکا ہے۔ مسلمان شیواجی پارک سے نکال دیئے گئے ہیں۔ کہیں کہیں اکا دکا گھر مسلمانوں کا رہ گیا ہو تو رہ گیا ہو۔ مجھے اس کی خبر نہیں۔ ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ زندگی اب پھر پرانے ڈھرے پر آ چلی ہے۔ لوگ باگ پھر راتوں کو گھروں سے سیر کے لئے نکلنے لگے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کے قہقہے بھی سنائی دے رہے ہیں۔ سمندر کے کنارے وہی بڑے والے۔ پھول والے اور ناریل بیچنے والے گھوم رہے ہیں۔ کھمبوں پر شمعیں روشن ہیں اور گجراتی سیٹھوں کی قیمتی گاڑیاں زناٹے سے گزر جاتی ہیں اور آدمی انہیں تکتا رہ جاتا ہے۔ دوبتر سنگھ کی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔ اس کے گھر اب شراب کی بوتل پہنچائی نہیں جاتی۔ نہ سو پچاس روپے کی آمدنی ہے۔ کوئی اس کے گلے میں پھولوں کا ہار نہیں پہناتا اسے ہندو دھرم کا رکھشک نہیں بناتا۔ بڑے بڑے سیٹھ جو فساد کے دنوں میں اس کے گلے میں باہیں ڈالے پھرتے تھے اب اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔

دوبتر سنگھ طوفان کا اکھڑا ہوا پودا ہے۔ ڈول رہا ہے۔ زہر اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ اس کے حمایتی ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے ہیں مگر ایک معقول تعداد ابھی باقی ہے۔ کم تنخواہوں والے کلرک۔ دھوبی۔ نائی۔ کنجڑے۔ ڈرائیور۔ کرخندار بے کار زندگی کے ستائے ہوئے لوگ۔ درغنڈے جنہوں نے کبھی ماں کا دودھ پیا تھا اور آج زندگی کا زہر پیتے ہیں۔ یہ لوگ سوچتے ہیں کہ مسلمان چلے گئے۔ لیکن بیکاری ختم نہیں ہوئی۔ کپڑا نہیں ملتا۔ مکان نہیں ملتا۔ تنخواہ نہیں بڑھتی۔ مسلمان چلے گئے۔ لیکن چیزیں سستی نہیں ہوئیں۔ ہاں امیروں کے پاس موٹریں اسی طرح ہیں۔ ان کے گھروں میں وہی شان و شوکت ہے۔ ان کے کارخانے اسی طرح چلتے ہیں۔

مسلمان چلے گئے۔ بھگا دیئے گئے۔ مار ڈالے گئے۔

لیکن دوبتر سنگھ بدستور بھوکا ہے

دو چار روز تو اس نے صبر کیا۔ پھر پریشان ہو کر اس نے سیٹھ دلپت کی موٹر روک لی اور اس سے کہا۔

"سیٹھ وہ تمہارے وعدے کدھر گئے؟"

سیٹھ نے خشونت سے کہا: "کیسے وعدے؟"

"وہی میں یہ کر دوں گا۔ وہ کر دوں گا۔"

"کیا نہیں کیا میں نے، اور کیا مانگتا ہے؟ یہ لے پانچ روپے۔"

"پانچ روپے نہیں چاہئیں۔ وہ تیرے آدمی کو جو کرنل اشرف کا فلیٹ دلوایا تھا۔ اس کا کمیشن پانچ سو بنتا ہے۔ وہ بولتا تھا دوں گا۔ ابھی تک نہیں دیا۔"

"تو مجھ سے کیوں مانگتا ہے، راستے میں موٹر روک کے کھڑا ہوتا ہے۔ سالا پولیس میں چالان کرا دوں گا۔"

"پولس میں چالان کرا دے گا؟" دوبتر سنگھ گرجا: "تیری بہن دی ۔۔۔۔"

کروم سے موٹر اس کے ہاتھوں سے نکل گئی اور وہ سڑک پر گر کر مرتے مرتے بچا۔"

رات کو اس نے سیٹھ دلپت کے آدمی کو قتل کر دیا جس نے اسے پگڑی کا کمیشن نہیں دیا تھا۔ اب مرہٹی سیٹھوں نے اسے گرفتار کرا دیا جنہوں نے بیسوں مسلمانوں کے قتل ہو جانے پر بھی اسے پولس کے ہاتھوں سے بچایا تھا۔ جھوٹی گواہیاں دے کر۔ اب وہ ہندو دھرم کا رکھشک نہ رہا تھا۔ شیواجی پارک کے امن کا دشمن تھا۔

اس کے خلاف جو الزام لگائے گئے۔ وہ یہ تھے۔

۱۔ وہ پنجابی تھا

۲۔ وہ پنجابی غنڈہ تھا

۳۔ وہ سکھ تھا

۴۔ وہ سکھ قاتل تھا

۵۔ اس نے ایک مسلمان عورت کے خاوند کو قتل کرکے اُسے اپنے ہاں زبردستی رکھ لیا تھا۔

۶۔ اس نے سیٹھ دلپت مارواڑی کی موٹر روک لی تھی۔

۷۔ موٹر روک کر اُس نے قتل کی دھمکی دی تھی۔

۸۔ اس نے سیٹھ دلپت کے باڈی گارڈ کو قتل کر دیا تھا اور اُس فلیٹ میں دوسرے لوگوں کو قتل کرنے جا رہا تھا کہ اُسے پولس نے گرفتار کر لیا۔

۹۔ وہ شیواجی پارک میں جہاں صرف شریف لوگ بستے ہیں۔ ان کے لئے خطرہ تھا۔

ان الزامات کی بنا پر اسے نو دفعہ پھانسی کی سزا ہو سکتی تھی۔ لیکن اُسے صرف ایک دفعہ پھانسی کی سزا ہوئی اور وہ پھانسی پر چڑھا دیا گیا اور اس طرح دو ہتھڑ سنگھ۔ سردار۔ قوم سکھ۔ عمر تیس سال۔ ساکن لائل پور مر گیا۔ تاریخ وفات ۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۷ء۔

لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اس سے بہت پہلے مر چکا تھا۔ مار ڈالا گیا تھا۔ سردار دو ہتھڑ سنگھ جو لائل پور کا کسان تھا جس کی عمر تیس سال کی تھی اور وہ جو ماہیا اور ہیر گایا کرتا تھا اور ہر روز اپنے کھیتوں پر کام کرتا تھا جس کے دو بوڑھے ماں باپ تھے۔ ایک نوجوان شرمیلی بیوی تھی اور شریر آنکھوں والے معصوم بچے۔ وہ سردار ۱۵ر اگست کو مار ڈالا گیا۔ یہ قتل باہمی سمجھوتے سے ہوا اور اس کے قاتلوں میں کانگریسی بھی تھے اور لیگی بھی اور ہر وہ ہندوستانی جس نے اپنے آرام کی خاطر پنجاب کی روح کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔

احمد ندیم قاسمی

غزل

اگر حضور ابھی مائلِ ظہور نہ تھے
تو تشنگانِ محبّت بھی ناصبور نہ تھے

اُفق کی دُھند میں لپٹے ہوئے چراغ سے ہیں
وُہ دِن جب آپ کے انداز پُر غرور نہ تھے

جزا تو خیر، سزا کے لئے ترستے رہے
غلام آپ کے اتنے تو بے قصور نہ تھے

پسِ نقاب مری بے بسی پہ قہقہہ زن
میں جانتا ہوں کہ تقدیر تھی حضور نہ تھے

رسائی اصل میں ہے انتہائے سرشاری
مسافرانِ محبّت تھکن سے چُور نہ تھے

مرے نصیب کو کیوں تابعِ نجوم کیا
اگر نجوم مری دسترس سے دُور نہ تھے

میں مصلحین کا منکر نہیں ندیمؔ، مگر
کبھی کے مدِّ نظر عشق کے اُمور نہ تھے

مُبارک احمد

اظہار

زمیں پہ بیٹھ کر کوئی اگر کہے کہ چاند ایک ابروئے خمیدہ کی مثال ہے
تو تو کہے گا دوریٔ نگاہ بھی تو اک سوال ہے۔
بایں دلیل تجھ سے کہہ رہا تھا میں کہ چرخِ نیلی فام سے نگاہ کو ہٹا ذرا
سمٹتی پھیلتی فضائے نیلگوں کے دائرے میں چند روز کے لئے پھسلنا چھوڑ کر
مرے قریب — اس قدر قریب آ
کہ تیرے میرے درمیاں جو بھی رنگ ہے مٹے
تو پھر کہیں تجھے　پتہ چلے گا یہ، کہ میری آنکھ میں
چمکتا قطرہ بھی نہیں — چمکتی جھیل بھی نہیں — یہ بحر ہے
یہ بحر جس کی ہر مچلتی لہر اک سکون کا پیام ہے
مگر میں پھر بھی ڈرتا ہوں
میں جانتا ہوں بحرِ بے کنار میں کئی جگہ بھنور بھی ہیں
ہر ایک لہر گھومتے بھنور کو دیکھنے کے واسطے اچھل اچھل کے موجِ تند و تیز بنتی جائے گی
ہر ایک موج گھومتے بھنور کو بس میں لانے کے لئے بڑھے گی — مٹتی جائے گی،
— بھنور کے دائرے کو اور بھی بڑھائے گی۔
(بھنور جو آج گھومتا ہے سیلِ رنگِ آب پر)
مگر ابھی سکون ہے
مگر میں پھر بھی ڈرتا ہوں کہ یہ سکوں طلاطمِ نہفتہ کی دلیل ہے
طلاطمِ نہفتہ کے خیال سے فرار چاہتا ہوں میں
تو آج میں نے ایک ڈھنگ سوچ ہی لیا۔ مگر یہ کیسی اندھی سوچ ہے
میں اپنا ہات آنکھ پر رکھے ہوئے ستادہ ہوں
ہر ایک سمت سوچ کی حدوں سے دور، تیرگی میں گہرا گہرا اک سہانا راز ہے
ہر ایک انگ مست مست، نرم نرم راگنی کا ساز ہے
مگر میں پھر بھی ڈرتا ہوں کہ یہ سکون ساعتی فتیلۂ حیات ہے۔

حیات ہے — میں غلط سمجھ رہا تھا اتنی دیر سے
حیات اس جگہ کہاں، حیات تو
افق کی سرخیوں سے دور، اجنبی دیار میں
وفورِ شوق کے طفیل "فرقِ این و آں" کو چھوڑ" ایک رنگ" کا لبادہ اوڑھکر
کھڑی ہے میرے انتظار میں
تو کیوں نہ میں وہاں چلوں،
مگر جب آگے بڑھنے، رستہ دیکھنے کے واسطے میں اپنا ہات آنکھ سے ہٹاتا ہوں
تو ایک سنگِ جادہ بحرِ بے کراں کو پاتا ہوں
مگر یہ کیا کہ تو تو اب بھی کہہ رہا ہے "تیری آنکھ میں چمکتے قطرے کی مثال ہے"
تجھے خبر نہیں کہ یہ بھی ایک دوریٔ نگاہ کا سوال ہے
ذرا مرے قریب آ کے دیکھ، میری آنکھ میں
چمکتا قطرہ بھی نہیں، — چمکتی جھیل بھی نہیں، — یہ بحر ہے!

عبدالمجید بھٹی

برہمن

چھَن، چھَن، چھَن،

چھَن!
چھَن چھَن، چھَن چھَن، چھَن چھَن چھَن!
چھَن چھَن
چھَن!
چھَن — چھَن — چھَن — چھَن!

اے حمید

منزل منزل

راجدہ نے کہا تھا میرے متعلق افسانہ مت لکھنا۔ میں بدنام ہو جاؤں گی۔

اس بات کو آج تیسرا سال ہے اور میں نے راجدہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا اور نہ کبھی لکھوں گا۔ اگرچہ وہ زمانہ جو میں نے اُس کی محبت میں بسر کیا۔ میری زندگی کا سُنہری زمانہ تھا۔ اور اُس کا خیال مجھے ایک ایسے باغ کی یاد دلاتا ہے۔ جہاں سدا بہار درختوں کی پرسکون چھاؤں میں سجے گلاب کے پھولوں کے جھاڑ مُسکرا رہے ہوں اور جس کی کھلی اور آزاد روشوں پر خوشحال لوگ محوِ خرام ہوں۔ پھر بھی میں اس باغ کے متعلق کچھ نہیں کہونگا۔ خواہ اس میں راجدہ کی بدنامی ہو یا نیک نامی —— جب سے راجدہ جُدا ہوئی ہے۔ میں نے اِس گلاب کے پھولوں اور کھلی روشوں والے باغ کے دروازے بند کر دیئے ہیں اور راجدہ کو مجھ سے جُدا ہوئے آج تیسرا سال ہے۔

اس عرصے میں راجدہ کو میں نے ایک پل کے لئے بھی نہیں دیکھا۔ اور شاید اُس نے بھی مجھے نہ دیکھا ہو۔

ہم —— جو ایک دوسرے کی پل بھر کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ زندگی کے تین سال ایک دوسرے سے جُدا رہ کر چُپ چاپ بسر کر گئے ہیں۔ ان تین سالوں پر سے گذر کر پیچھے کی طرف جاتے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں جھڑتے ہوئے پتوں والی ایک پژمردہ سڑک پر چل رہا ہوں۔ جو قبرستان میں سے ہو کر گذرتی ہے۔

اُن دنوں میں لاہور کے ایک اخبار کے دفتر میں ملازم تھا۔ گھر چونکہ امرتسر میں تھا۔ لہٰذا شام کی گاڑی واپس اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ اگرچہ لاہور میں بڑی آپا کا گھر تھا۔ اور وہ لوگ میری اس ہر صبح سفر ہر شام سفر والی زندگی پر مجھے اکثر "بالو کلرک" کہا کرتے تھے۔ تاہم جو مزا اپنے گھر میں تھا وہ نہ بلخ میں تھا نہ بخارے میں —— علاوہ ازیں میری عادت کہ میں امرتسری ڈنگر بزدل کی طرح سال میں چھ مہینے کام کرتا ہوں۔ اور باقی چھ مہینے گھر بیٹھ کر ان دنوں کی کمائی کھاتا ہوں —— ان حالات کے پیشِ نظر اپنا گھر چھوڑنا عین حماقت تھی!

لیکن راجدہ سے ملنے کے بعد میں نے امرتسر تقریباً چھوڑ دیا۔

آج سے تین سال پہلے موسم گرما کی وہ ایک گرم اور چمکیلی شام تھی۔ میں ابھی ابھی گاڑی سے اُترا تھا۔ مجھے حسبِ معمول بھوک لگ رہی تھی۔ تیز تیز قدم اُٹھاتا پُرشور بازاروں اور دُھندلی گلیوں میں سے گذرتا میں گھر کی سمت بڑھ رہا تھا۔ ابھی میں گھر کی سیڑھیوں میں ہی تھا۔ کہ مجھے اوپر بھانجی کی آواز سُنائی دی بھانجی اور میں ہم عمر تھے۔ اور ایک ساتھ کھیلے اور پڑھے ہوئے تھے۔ وہ کافی دنوں کے بعد اپنی نانی کے گھر آئی تھی۔ اور میں اُسے بڑے آرام سے ملنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں سیدھا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ کپڑے اُتارے۔ ٹھنڈے پانی سے غسل کیا۔ اور کپڑے بدلنے لگا۔ بھانجی چھوٹے بھائی سے کسی نئی فلم کی ہیروئن کے بارے میں گرما گرم بحث کر رہی تھی۔ اُس کے خیال میں ہیروئن ہیرو سے زیادہ خوبصورت تھی۔ مگر چھوٹا بھائی کہتا تھا کہ ہیروئن کی آنکھیں بھینگی ہونے کے علاوہ اُس کی مونچھیں بھی تھیں۔ اس لئے وہ کسی طرح بھی خوبصورت نہیں کہلائی جا سکتی ——

کپڑے بدل کر میں صحن میں آ گیا۔ بھابی مجھے دیکھتے ہی اُچھل پڑی۔ میں بھی تقریباً اُچھل پڑا۔ سب قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔ وہاں شور مچ گیا جس میں میرے اور بھابی کے قہقہوں کی آواز نمایاں تھی۔ یونہی میری نظر صحن کے پیچھے، صحن کے دوسرے آدھے حصے پر پڑی وہاں بھابی کی نند عظمیٰ بیٹھی ہمارے قہقہوں میں دلچسپی لے رہی تھی۔

"تو گویا آپ بھی ہیں؟"

اور میں چیخ اٹھا تیزی سے اُس کے پاس پہنچ گیا۔ عظمیٰ کے ساتھ ایک اور لڑکی بیٹھی تھی۔ جسے میں نے بالکل نہ دیکھا اور جس نے مجھے دیکھ کر جلدی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں ذرا ٹھٹھک گیا۔ اتنے میں بھابی بھی آ گئی۔ اور اُس لڑکی کو مجھ سے پردہ کرتے دیکھ کر بول اُٹھی۔

"حد ہو گئی، بھلا ماموں سے کیا پردہ۔

ہاں بھئی، بھلا یہ بھی کوئی پردے کا موقع ہے۔ عظمیٰ نے اُس لڑکی کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ اس دوران میں وہ لڑکی شرم سے سکڑی جا رہی تھی۔ اور اُس کے کانوں کی لَویں سُرخ ہو رہی تھیں۔ میں عظمیٰ اور بھابی سے باتیں کر رہا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے میں نے دو تین بار نظریں بچا کر اُس لڑکی کو دیکھا۔ باریک ہونٹ، ستواں ناک، جھالر سی پلکیں اور ہلکا گلابی رنگ۔ چپ چاپ بے زبان جیسے موم بتی——یہ تھی ماجدہ۔

اس سے پہلے میں نے ماجدہ کو کہیں اور نہیں دیکھا تھا۔ بھابی نے بتایا وہ عظمیٰ کے سسرال سے ہے۔ اور میں نے سوچا اگر وہ عظمیٰ کے سسرال سے نہ ہوتی تو مجھے کہاں ملتی؟ ویسے ماجدہ کا مجھ سے ملنا ناگزیر تھا۔ یہ میں اب سوچتا ہوں۔

شام کے کھانے کے بعد سیر کا پروگرام بن گیا۔ اور ہم سب کمپنی باغ کی طرف چل پڑے۔

باغ ابھی فاصلے پر تھا۔ کہ شام کے ٹھنڈے سائے ماند پڑ گئے اور مرطوب ہوا کے نیم جھونکے ہمارے جسموں سے چھوئے۔

باغ میں داخل ہوتے ہی ہم نے چنبیلی اور مولسری کے پھولوں اور ایسی مٹی کی خوشبو سونگھی جیسے نہر کے پانی سے سیراب کیا گیا ہو اور جہاں سے سارا دن تیز دھوپ میں گرم بخارات اُٹھتے رہے ہوں۔ شہر کی نسبت یہاں کی فضا آزاد اور مرطوب تھی۔ گرم ہوا بڑی نرمی سے چل رہی تھی اور گھنے درختوں کی گہری سبز شاخیں بے معلوم انداز میں ہل رہی تھیں۔ سڑک پر چھڑکاؤ کیا ہوا تھا اور بجلی کے پرانے لیمپوں کی زرد روشنی میں وہاں سے نظر نہ آنے والی بھاپ سی خارج ہو رہی تھی۔ پیشانیوں پر پسینے آ رہے تھے۔ اور عورتیں برقعوں سے پریشان ہو رہی تھیں۔ پردہ کلب کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے اپنے برقعے اس پھرتی سے اُتارے جیسے اُن میں خطرناک بیماریوں کے جراثیم پیدا ہو گئے ہوں اور لپک کر کلب میں داخل ہو گئیں۔ اندر چاروں طرف پردہ ہی پردہ تھا۔ اور کلب کا کہیں نشان تک نہیں تھا سوائے اس کے کہ معمولی سے خطے کے عین وسط میں آم کا درخت تھا۔ جس کے پاؤں میں ایک دو شکستہ بنچ پڑے تھے اور دوسری طرف دو پینگیں لٹک رہی تھیں۔ عورتوں کو یہاں صرف دو چیزیں کھینچ لاتی تھیں۔ پہلی چیز کلب کی پینگیں اور دوسری برقعے سے نجات۔

میں کلب کے باہر، بوڑھے پہریدار کے مصلے پر بیٹھ گیا اور اُس سے وضو کے فوائد اور نماز کی برکتوں پر لیکچر سنتا رہا۔ وہ تسبیح پھیرتے ہوئے باتیں کر رہا تھا۔ اور میں بڑی توجہ سے اُسے تک رہا تھا۔ دراصل میں اُسے نہیں بلکہ اُن دوڑتے ہوئے سپید سپید پاؤں اور پھڑپھڑاتی شلواروں کو تک رہا تھا۔ جو بوڑھے کی گردن کے پیچھے سے مجھے جھاڑیوں کے عقب میں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

کافی دیر بعد بھابھی، عظمیٰ، ساجدہ، اماں اور چھوٹی بہنیں، اور بچے باہر نکلے۔ اُن سب کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اور اُن کے جسموں سے گرم گرم پسینے کی تیز بُو اُٹھ رہی تھی۔ پردہ کلب سے ذرا آگے جا کر سپید گنبد والا ریڈیو اچانک شروع ہو گیا اور نورجہاں کی تیز آواز سارے کمپنی باغ میں پھیل گئی۔

"۔۔۔۔ آ رات جا رہی ہے۔۔۔۔"

ہم لوگ گنبد کے دائیں طرف والے نئے پلاٹ میں داخل ہو گئے۔ جہاں سُرخ اینٹوں والی چمکیلی روشوں پر سُرخ اور زرد گلاب کے پھولوں کی بیلیں سایہ کئے ہوئے تھیں اور نیچے پلاٹ میں پانی دیا ہوا تھا۔ میں عظمیٰ اور اماں ایک سنگین نشست پر بیٹھ گئے اور نورجہاں کا گانا سننے لگے۔ یہ جگہ ایک لمبے اور گنجان درخت کی اوٹ میں تھی، اور قریب ہی جھاڑیوں میں جگنو چمک رہے تھے۔ اماں بڑے غور سے گانا سُن رہی تھی۔

"یہ لے بی نورجہاں ہے"، اماں نے عظمیٰ سے کہا۔ جس نے شاید ہی کوئی بدصورت کا زنانہ شو چھوڑا تھا۔

دوسرے لوگ پلاٹ کی روشوں پر آزادی اور مسرت کے ساتھ دوڑ رہے تھے۔ اُن کی ایک دوسرے کو پکارنے کی آوازیں باغ کی گرم اور کھُلی فضا میں گونج رہی تھیں۔

"ساجدہ دیکھ کر چلنا کہیں کانٹا نہ چبھ جائے۔" یہ آواز بھابھی کی تھی۔

میں نے پہلو بچا کر دیکھا۔ راجدہ دونوں ہاتھوں سے ساٹن کی سفید شلوار کے پائنچے اُٹھائے پلاٹ کے پانی میں چل رہی تھی۔

"اوئی ـــ پانی بڑا ٹھنڈا ہے۔ تم بھی آ جاؤ، میں بھی آ جاؤں؟ مگر کیسے؟ ـــ" لیکن راجدہ نے بھابھی کو بُلایا تھا جو تھوڑی دیر بعد پانی میں اُتر گئی اور بچوں نے بھی بڑوں کا ساتھ دیا۔ پانی گدلا تھا اور اس کی سطح پر جا بجا زرد زرد گھاس اور سوکھی ٹہنیوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ اور جو بچوں کے گھٹنوں تک آتا تھا۔ بچے ہاتھوں سے پانی کے چھینٹے اُڑاتے، شور مچاتے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ان میں میری چھوٹی بہنیں بھی تھیں اور چھوٹے بھائی بھی ـــ بھابھی راجدہ کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور راجدہ ایک تتلی کی مانند پھرتی سے بھاگتی ہوئی کبھی ایک پودے کا چکر لگاتی اور کبھی لپک کر دوسری طرف نکل جاتی میرا دل بھی پانی میں اُترنے کو چاہا۔ مگر امی کو دیکھتے ہوئے ہمت نہ پڑی۔ آخر میں نے عظمیٰ سے کہا۔

"بھابھی بھلا تم کیوں بیٹھی ہو۔ چلو پانی میں"،

"نا بابا میرے پائنچوں کی کلف اُتر جائے گی۔ اور میں ایک ہی شلوار ساتھ لائی ہوں"!

جب یہ لوگ تھک گئے تو شلواریں قمیضیں جھاڑتے پانی سے باہر نکل آئے۔ بچوں نے تو سارے کپڑے پانی میں بھگو ڈالے تھے راجدہ کے بال کھُل گئے تھے۔ جنہیں وہ لاپروائی سے پیچھے ڈالے ہوئے تھی۔ اُس کی پیشانی اور مونچھوں والی جگہ پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے سڑک والے لیمپ کی روشنی میں جھلملا رہے تھے۔ اتفاق سے میں راجدہ کے قریب کھڑا تھا۔ اور راجدہ نے کئی بار مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے اُسے گلہ ہو کہ میں عظمیٰ کے پاس کیوں بیٹھا رہا اور پانی میں کیوں نہیں اُترا۔ جب وہ سینڈل کے تسمے باندھنے کے لئے جھکی تو ساکت فضا میں نرم ہوا کی لہریں سی پیدا ہوئیں، اور میں نے راجدہ کے پسینے میں ملی ہوئی حنا کی گرم اور خوشگوار خوشبو سونگھی۔

جب ہم باغ سے نکلے تو ہوا بڑے پیارے انداز میں چلنے لگی۔

سڑک کے کنارے والے درختوں کی خاموش چھاؤں میں بے معلوم سرگوشیاں سی ہونے لگیں۔

گرمیوں کی رات کے گہرے نیلے آسمان پر ستاروں کے چمکیلے پھول جابجا ٹکے ہوئے تھے۔ اور کمپنی باغ جہاں سے ریڈیو کی آواز ابھی تک آ رہی تھی، ہم سے پیچھے رہ گیا تھا۔ عظمیٰ اور اماں آگے آگے تھیں۔ راجدہ اور بھابھی اُن کے پیچھے اور میں ذرا پرے ہٹ کر بچوں کو لئے چل رہا تھا۔ راجدہ قدرے اونچی آواز میں بھابھی سے ہمکلام تھی۔

'سچ میں تو ایسی راتیں باغوں ہی میں گذارنا چاہتی ہوں۔ بس پائینچے اُٹھائے پانی میں گھومتی پھرتی رہوں۔ اور جب تھک جاؤں تو گلاب کی پھولوں بھری بیلوں کے سائے میں ٹھنڈے بنچ پر سو جاؤں ــــــ

خدا کی قسم گرمیوں میں گھروں اور گلیوں میں میرا دل بہت گھبراتا ہے ــــــ وہ بڑی بے باکی سے اپنی خواہشات کا اظہار کر رہی تھی۔ اور میں اس سوچ میں تھا۔ کہ یہ وہی راجدہ ہے۔ جو عظمیٰ کے ساتھ چق کی اوٹ میں بیٹھی تھی۔ اور جس نے مجھے دیکھکر پردہ کر لیا تھا

دوسرے دن شام کے وقت پھر سیر کی تیاری ہونے لگی۔ اُس روز میرا پروگرام راجدہ کو کرسٹل میں آئس کریم کھلانے کا تھا چنانچہ صبح ہی کو میں نے اپنی ایک ڈکشنری بیچ ڈالی تھی۔ جس کے عوض مجھے چھ روپے بارہ آنے ملے تھے۔ یہ رقم چھ سات لوگوں کو آئس کریم کھلانے کے لئے کافی تھی۔ سیر کے بعد میں اُن سبھوں کو کرسٹل میں لے آیا۔ کرسٹل کے ایک کیبن میں سوائے میرے اور چھوٹے بھائی کے باقی سب لوگ بیٹھ گئے۔ ہم کرسٹل کے ہال کمرے میں بیٹھ گئے۔ جہاں میں بیٹھا تھا۔ وہاں سے مجھے راجدہ کی شکل اچھی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ وہی باریک ہونٹ، خوبصورت ستواں ناک، لمبی پلکوں کے پُرسکون سایوں والی آنکھیں جو بڑی نرمی اور محبت سے ایک منظر سے دوسرے منظر کی طرف گھومنے کی عادی تھیں۔ ماتھے کے اوپر سر کے سیاہ بالوں کی اُبھری ہوئی دو پہاڑیاں اور اُن کے درمیان میں بہتی ہوئی مانگ کی دودھیا نہر ــــــ کرسٹل کے بیڈ بنہ کیبن کے شیشوں میں سے راجدہ نے پہلی مرتبہ مجھے ہمدردی اور محبت کی پاک اور بے لوث نظروں سے دیکھا۔ اور میرے دل میں اُس کی عزت اور توقیر اور بڑھ گئی۔ جیسے اُس نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہو۔

راجدہ کی نظریں طلوع ہوتے ہوئے سورج کی اولین نرم اور پاکیزہ کرنیں تھیں۔ جو نیند میں شرابور پھولوں کے لئے پیغام بیداری لیکر آتی ہیں۔

کرسٹل سے نکل کر ہم لوگ گھر کی طرف جا رہے تھے۔ ایک جگہ بازار میں اندھیرا سا تھا اور لوگ نسبتاً کم آ جا رہے تھے راجدہ نے نقاب اُٹھا کر پیچھے مُڑ کر مجھے دیکھا۔ سیاہ نقاب میں اس کا صندلی خوبصورت چہرہ ــــــ جیسے رات کی تاریکی میں کسی خانقاہ کا کھلا اور روشن طاق۔ جہاں موم بتیاں جل رہی ہوں۔ (دراصل راجدہ کو پہلی بار دیکھنے پر جو خیال سب سے پہلے میرے ذہن میں آیا تھا۔ وہ محض ایک موم بتی کا خیال تھا۔ موم بتی ــــــ خاموش اور بے زبان) میرے ساتھ چونکہ بچے بھی تھے چنانچہ لازمی طور پر سب سے پیچھے تھا۔ راجدہ بھی ہوتے ہوتے پیچھے آ گئی۔ قریب پہنچکر اُس نے بچوں کو تیز تیز چلنے کو کہا۔ اور مجھے دیکھکر بولی

'آپ بھی پیچھے ہیں کیا؟' اور اتنا کہکر جلدی سے آگے نکل گئی۔ میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

اُس رات خواب میں راجدہ کو میں تمام رات کمپنی باغ کی سیر کرواتا رہا۔ اور کرسٹل میں آئس کریم کھلاتا رہا۔

دوسرے دن ــــــ دوپہر کے کھانے کے بعد کیرم بورڈ کھیلتے ہوئے سینما کا پروگرام بن گیا۔

فلم تھی "من کی جیت" جو مجھے بیحد پسند تھی۔ اور میں چاہتا تھا کہ راجدہ بھی اسے دیکھے۔ دعوت بھی میں نے ہی دے ڈالی۔

اور پھر اس سوچ میں پڑ گیا کہ ٹکٹوں کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ "الف لیلیٰ" قصہ حاتم طائی بانصویر اور محبت بھرے خطوط، بہشتی زیور اور جنت کی کنجی، بیچنے گیا مگر کسی دوکاندار نے یہ کتابیں نہ خریدیں —— امی سے کچھ روپے اُدھار مانگے۔ لیکن اُس نے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ تنخواہ ملنے کے بعد میں دو تین دن تک ادھر نہیں آیا کرتا ——

نہ معلوم راجدہ میری اس ذہنی پریشانی کو کس طرح بھانپ گئی۔ چنانچہ اُس نے اعلان کر دیا۔ کہ فلم ہم سبھی دیکھیں گے مگر اس شرط پر کہ ٹکٹیں اپنی اپنی لینی پڑیں گی۔ اِس پر میں نے بڑی مخالفت کی۔ دل میں ڈرتے ہوئے کہ کہیں میری مخالفت کامیاب ہو گئی تو پھر کیا ہو گا۔ مگر خیریت گذری کہ راجدہ کی سکیم باتفاق رائے پاس ہو گئی۔ اور سینما کی تیاریاں ہونے لگیں۔ نہایا گیا کپڑے بدلے گئے۔ جوتے پالش ہوئے۔ اسی نے پان کے ٹکڑوں سے ڈبیا بھر لی۔ بھابھی نے حنا کی ساری شیشی اپنے کپڑوں پر انڈیل لی۔ اور اُس کی تیز خوشبو سے دماغ چکرانے لگے۔ ایک طرف راجدہ بال بنا رہی تھی۔ عظمیٰ نے استری گرم کر رکھی تھی۔ اور تین چار رومال آگے ڈالے انہیں نم کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔

بھابی تم نے اچھا کیا۔ جو تین چار رومال رکھ لئے۔ فلم میں کئی بار آنسو نکل آتے ہیں، عظمیٰ بھابی مسکرانے لگی۔ اور راجدہ نے بھابھی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہمیں رونا نہیں آتا" اور میں بے اختیار کہہ اُٹھا۔

"خدا نہ کرے کہ رونا آئے" —— اور عظمیٰ نے زیر لب ہنس کر پوچھا۔

"راجدہ کا بڑا خیال ہے" راجدہ شرم سے ڈوب سی گئی۔ میں خود بات کر کے پشیمان ہو رہا تھا۔ بھابھی نے پلٹ کر عظمیٰ کی طرف دیکھا۔ جو رومال استری کر رہی تھی اور جس کے ہونٹوں پر اُس کی ناک سے بھی زیادہ تیکھی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اور ہنس کر بدستور سوٹ کیس میں سے کچھ نکالنے لگی۔

—— سینما ہال میں انٹرول کے وقت میں نے عظمیٰ سے فلم کے بارے میں اُس کی رائے پوچھی۔ جس پر وہ شرما سی گئی۔ شاید اُسے ستارہ ٹوٹنے والے استعارے کا خیال آ گیا تھا۔ جس کے فوراً ہی بعد انٹرول ہو جاتا ہے۔ راجدہ اور بھابھی، امی کے دائیں بائیں بیٹھی تھیں۔ اور اُس سے پان لے کر کھا رہی تھیں۔ میں اُٹھا اور پان خریدنے کے لئے باہر بازار میں آ گیا۔ پان میں نے علیحدہ علیحدہ بندھوائے۔ اس طرح مجھے یقین تھا۔ کہ راجدہ کو بھی ہر صورت پان پیش کر سکوں گا۔ پان لئے جب میں بکس میں داخل ہوا تو فلم شروع ہو چکی تھی۔ اندھیرے اور فلم کی ہلکی روشنی میں مجھے ان لوگوں کے صرف سر ہی دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے ایک ایک کر کے سب کو پان پیش کر دیئے اور جب راجدہ کی باری آئی۔ تو میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ——

اُف توبہ! —— اُس کا ہاتھ کس قدر سرد ہو رہا تھا۔ جیسے میں نے برف سے لدے ہوئے گلاب کے پھولوں پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اس کے ہاتھ میں اُس کے حصے کا پان ویسے ہی پڑا تھا۔ اور میں اُس کے دل کی تیز دھڑکن اچھی طرح محسوس کر رہا تھا میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور باقی وقت ہال میں بیٹھا۔ راجدہ کے ہاتھ کی نرمی اور سردی کو اپنے جسم میں پھیلتے محسوس کرتا رہا۔ فلم ختم ہو گئی اور ہم گھر آ گئے۔

رات بھر راجدہ کے ہاتھ کا سرد لمس مجھ پر دھندلے بادل کے ٹکڑے کی مانند سایہ فگن رہا۔ اور میں نے اُسی کے خیال میں رات گذار دی۔

صبح اتوار تھی —— دوپہر کے وقت بھابھی نے ڈھولک بجانے کا پروگرام پیش کر دیا۔ جسے بچوں اور چھوٹی بہنوں نے

ہاتھوں ہاتھ لے لیا —— تھوڑے ہی وقفے کے بعد کہیں سے کسی ہوئی تیز اور گھمک دار ڈھولک بھی آگئی اور بچے اُلٹے سیدھے ہاتھ مارنے اور بے سُری الاپنے لگے۔ بالآخر بھابی جی آگے بڑھی اور ڈھولک ایک جچی تُلی تال پر دھمکنے لگی۔ دو تین منٹ لگاتار بتالی ڈھولک ہی دھمکتی رہی۔ اور کسی کے گانے کی آواز نہ آئی۔ بھابی جی تھم گئی اور چہک کر بولی۔

'بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی —— گاتیں کیوں نہیں؟

راجدہ نے شرما کر منہ پھیر لیا اور بھابی عظمی ہنسنے لگی۔ اور بھابی جی کو غصہ آگیا۔ اُس کا گول گول مُنہ لال ہو گیا۔ اور بھنویں سُکڑ سی گئیں۔ اُس نے ایک ہاتھ زور سے ڈھولک پر مارا اور گانا شروع کر دیا۔

؎ اساں گو بھی تڑکی اے
اَدھی راتیں دیہ آیا — گرگابی کھڑکی اے۔

اُس نے ڈھولک کی تھاپ کے درمیان ہی تیز آواز میں کہا۔

"بھئی یہ بڑی بُری بات ہے" گاؤ نا سب، آخر یہ منگوائی کس لئے ہے؟

چنانچہ بھابی عظمی نے منہ لٹکا کر گلا صاف کیا اور بول اُٹھائے۔ اُس کی آواز نرم اور لوچدار تھی۔

؎ پیا جھرمٹ بدلاں دا
روواں رات دنے — اے وچھوڑا سجناں دا۔

اب راجدہ کی باری آئی۔ اُس نے گردن نیچی کر لی۔ عظمی اور بھابی جی اور بچے ہنسنے لگے۔ اتنے میں ایک نرم اور نکھری ہوئی آواز ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ اوپر اُٹھی۔ شعلے کی طرح بے چین — مضطرب اور زخم خوردہ ——

؎ دو پتر اناراں دے
ساڈا دُکھ سن سن کے —— روندے پتھر پہاڑاں دے

اور میرے ذہن میں ایک تصویر کھنچ گئی۔ جیسے کوہ ہمالیہ کے گھنے اور تاریک جنگلات میں موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ اور تیز رفتار پہاڑی نالے نشیب کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ لیکن یہ تصویر کچھ غلط تھی۔

پھر ایک اور تصویر سامنے آئی۔ سادہ مگر سوگوار سی۔ جیسے شام کا گیت۔

سنسان پہاڑیوں پر رم جھم رم جھم۔ مدھم بارش کی غمگین موسیقی اور ادھر اُدھر پتھروں کو سیاہ اور چکنی سلوں پر سے رُک رُک کر ٹھہر ٹھہر کر پھسلتے ہوئے بارش کے موتی —— پتھروں کے آنسو ——

؎ روندے پتھر پہاڑاں دے ......

ڈھولک تھم گئی۔ شعلہ بجھ گیا۔ مگر سنسان اور گمنام پہاڑوں کے آنسو رُک رُک کر ٹھہر ٹھہر کر بدستور گر رہے تھے ---- اور میں اُن سے پوچھنا چاہتا تھا۔ تم کس کی یاد میں آنسو بہا رہے ہو؟

میں راجدہ سے پوچھنا چاہتا تھا۔ راجدہ تمہیں وہ کون دُکھ ہے۔ جسے سُن کر پہاڑ بھی رونے لگے؟

میں راجدہ سے پوچھنے کے لئے آگے بڑھا اور راجدہ امرتسر کے سٹیشن پر پلیٹ فارم نمبر ۴ پر بھابی جی اور عظمی کے ہمراہ لاہور جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئی۔ اس کی آنکھیں سوگوار سی تھیں۔ گھنی پلکوں کی پُرسکوں چھاؤں میں کہیں کہیں مدھم اور اُداس دھوپ کی چمک تھی۔ گاڑی چل پڑی۔ پلیٹ فارم پیچھے اور گاڑی آگے کھسکنے لگی۔ راجدہ نے آخری بار مجھے دیکھا

اُس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ ہمارے گھر ضرور آنا۔

گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی اور میں سٹیشن پر ادھر اُدھر پھرتا رہا۔ مجھے واپس گھر جاتے ہوئے ایک قسم کی جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے وہ میرا گھر نہ ہو۔

سٹیشن سے نکل کر میں سیدھا کرسٹل چلا آیا اور کافی دیر وہیں بیٹھا رہا۔ جب شام ہوگئی تو میں اُٹھا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ گلی اور بازار میں کافی رونق تھی۔ پر مجھے ہر شے اجنبی اور بے محل سی لگ رہی تھی۔ گھر پہنچ کر میں نے کسی سے بات نہ کی اور کھانا کھا کر خاموشی سے لیٹ گیا۔ صبح اُٹھا اور نوکری پر لاہور چلا آیا۔

لاہور پہنچتے ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے میں کئی سال سمندر پار بسر کرنے کے بعد پہلی مرتبہ اپنے وطن میں داخل ہو رہا ہوں۔ سڑکوں پر لوگوں کے چہرے بڑے مہربان اور مانوس معلوم ہو رہے تھے۔ جیسے اُن کے دل میری دوستی اور ہمدردی سے لبریز ہوں۔ دفتر سے نکل کر میں نے کئی بار راجدہ کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ مگر یہ خیال کہ اتنی جلدی وہاں چلے جانا مناسب نہیں۔ ہر بار مجھے روک دیتا۔

ایک روز بڑی آپا کو لاہور اچانک کوئی کام پڑ گیا۔ وہ میرے ساتھ لاہور آئیں اور میں انہیں راجدہ کے گھر لے گیا۔ میں راجدہ کے گھر پہلی مرتبہ داخل ہو رہا تھا۔ وہ گھر — جو بعد ازاں میرے دل پر اپنا گہرا اثر چھوڑ گیا — عظمیٰ اور راجدہ ہمیں مکان کی ڈیوڑھی میں ہی مل گئیں۔ وہ دونوں ایک بڑھیا سے جانے کیا خرید رہی تھیں۔ مجھے اور آپا کو اچانک اپنے بالمقابل دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گئیں اور حیرت اور خوشی سے اُن کے چھوٹے سے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔ راجدہ کے بال کھلے تھے۔ شاید وہ نہانے کی تیاری میں تھی۔ وہ ہم دونوں کو جلدی سے اوپر لے گئیں اور ہم درمیانی منزل میں پہنچ کر بیٹھ گئے۔ بھائی عظمیٰ نے پنکھا چھوڑ دیا۔

یہ کمرہ ہر قسم کے گھریلو سامان سے بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف شیشوں کی قدِ آدم الماریوں میں چینی کے برتن سجے تھے۔ دوسری طرف لمبے چوڑے خوبصورت پلنگ پر ریشمی تکیئے اور دھوتی کی سفید چادر پڑی تھی۔ نعمت خانے کے قریب میز پر ریڈیو رکھا ہوا تھا۔ آدھے فرش پر مٹیالے رنگ کا ایرانی قالین بچھا تھا۔ سنگھار میز کے گول آئینے پر جالی دار ریشمی پردہ لٹک رہا تھا۔ ایک طرف کوٹی اور پاؤڈر اور پیرس کی شام کی مختلف سائز کی شیشیاں پڑی تھیں۔ کارنس پر دونوں طرف پتلی اور لمبی گردن والے پھولدانوں میں گلاب کے پھول مسکرا رہے تھے۔ قریب ہی ایک چمکیلا سگریٹ کیس اور ماچس اور کچھ کتابیں پڑی تھیں۔ کارنس کے اوپر خوبصورت فریم میں سجی ہوئی ایک رنگین تصویر لٹک رہی تھی۔ یہ قدیم ایرانی تمدن کا ایک منظر تھا۔ شہر کا محراب دار پرانا دروازہ — اس میں سے نکلتے اور داخل ہوتے لمبے چغوں اور عماموں والے لوگ — دروازے کی بائیں سمت جالی دار جھروکوں والے مکانوں کے پیچھے اوپر کو اُٹھتے ہوئے مسجد کے دو دھیا مینار اور اُن کے عقب میں نیلے آسمان پر سفید کبوتروں کی ٹولیاں — مجھے یہ تصویر بے حد اچھی لگی۔ راجدہ اندر داخل ہوئی۔ اُس نے جلدی سے ایک تپائی ہمارے آگے رکھی اور باہر نکل گئی۔

پھر عظمیٰ آئی۔ اُس کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت ہاتھوں میں اخروٹ کی لکڑی کا ایک ٹرے تھا۔ جس میں جھاگ دار وِمٹو سے لبالب بھرے ہوئے دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ آپا نے کہا۔ آخر اس تکلف کی کیا ضرورت تھی، مگر میں خاموشی

سے دھڑا دھڑ پینے لگا۔ کیونکہ مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد راجدہ کی ادھیڑ عمر پتلی دبلی بے زبان سی ماں اور دوسری بھابی اختر بھی آ گئی۔ وہ ہمیں خندہ پیشانی سے ملیں۔ اور آپا کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ اُن کی باتیں لاہور کی گرمی، پیراشوٹ کی کلبیل، ریل کی دقتوں اور قمیصوں کے نت نئے نمونوں کے متعلق تھیں۔ جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پھر بھی اُن کی آوازیں مجھے بڑی خوشگوار محسوس ہو رہی تھیں۔ راجدہ بھی ایک طرف بیٹھی گفتگو میں شامل تھی۔ اُس وقت اُس گھر کی ہر چیز، دیاسلائی کی ڈبی سے لیکر راجدہ کے کھلے بالوں تک، مجھے اپنی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے یہ گھر میرا ہو۔ اِس گھر میں میں نے پہلی مرتبہ کھلے آسمان اور چمکیلی دھوپ کو دیکھا ہو۔ اور اسی ایرانی قالین پر میں نے لڑھک لڑھک کر چلنا سیکھا ہو اور اسی گھر کے باہر نیم روشن ٹھنڈی گلیوں میں چالاک بچوں کی منڈلیوں میں، میں نے اپنا بچپنہ گذارا ہو۔ یہ اجنبی اور مہربان خیال مجھے راجدہ کے اور قریب لے گیا۔

پھر راجدہ کے دونوں بھائی آ گئے۔ ہنس مکھ اور دوست نواز۔ ——— میں اُن سے اُٹھ کر ملا اور ہم دیوانخانے میں چلے آئے۔ یہ لمبا اور کھلا کمرہ اوپر کی نسبت زیادہ سرد اور پُرسکون تھا۔ یہاں سوائے ایک بڑی الماری، زمین پر بچھی ہوئی دری اور میز کے علاوہ تین چار آرام کرسیوں اور آتشدان کی کارنس پر رکھی ہوئی قائدِ اعظم کی رنگین تصویر کے اور کچھ نہ تھا۔ مجھے اِس کمرے کی سادگی اور خنکی بیحد تسکین بخش محسوس ہوئی۔ ہم کچھ دیر تک وہاں بیٹھے۔ نئی فلموں کے گانوں، تاش کی کھیلوں اور لیگ پارٹی کی خدمات پر باتیں کرتے اور سگریٹ پیتے رہے۔ اِس دوران میں مجھے اوپر سے راجدہ کے تیز اور بیساختہ قہقہوں کی صحت مند آواز کئی بار سُنائی دی۔ ساڑھے بارہ بجے دوپہر کی مجلس کا گجر بجا۔ تو ہم اوپر چلے گئے۔ راجدہ خود ریڈیو لگا رہی تھی۔ پہلا ریکارڈ شروع ہوا۔

"من کا ہے گھبرائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور راجدہ نے کنکھیوں سے پل بھر کے لئے مجھے دیکھا۔ اور مجھے سینما ہال والی وہ رات یاد آ گئی۔ جب پان پیش کرتے وقت میں نے اُس کا نرم اور سرد ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ گانے کی دھیمی اور دلنواز سُریں کمرے کی پُرسکون اور خوشبوؤں بھری فضا میں تیر رہی تھیں۔ اور راجدہ سب کی نظریں بچا کر میری طرف دیکھ لیتی تھی۔ اُس کی نگاہوں میں زندگی کی نرم خنکی اور بہار کی اولیں صبح کا اُجلا پن تھا۔ اُس کمرے میں بیٹھے بیٹھے مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں اکھڑ اور اُجڈ لوگوں سے بھری ہوئی کسی پُرشور ریل گاڑی سے نکل کر نرم دل گارڈ کے ڈبے میں آن بیٹھا ہوں۔ اور میں شام تک گارڈ کے ڈبے میں بیٹھا رہا۔ اور اگر آپا چلنے کو تیار نہ ہوتیں۔ تو شاید میں تمام عمر اُس ڈبے میں بیٹھا سفر کرتا رہتا۔ سٹیشن پر سٹیشن گذرتے جاتے۔ منزلوں پر منزلیں آتیں اور میرا سٹیشن کبھی نہ آتا۔ میری منزل کبھی نہ آتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آپا بُرقعہ پہننے لگیں۔ مجھے بھی کوٹ پہننا پڑا۔ جب ہم چلنے لگے۔ تو راجدہ نے پوچھا۔

'پھر کب آئیں گے آپ؟ اور آپا نے کہا۔

اب آپ لوگوں کو آنا چاہیئے۔ لیکن اُن لوگوں میں سے کوئی نہ آیا۔ اور تیسرے دن میں خود راجدہ کے گھر چلا گیا ——— وہ شام نہایت خوشگوار تھی۔ بارش ابھی ابھی رُکی تھی۔ اور آسمان ابھی تک ابر آلود تھا۔ مکانات اور سڑکیں دُھلی ہوئی تھیں۔ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بازاروں اور گلیوں میں لہرا رہے تھے۔ ٹھیک یاد نہیں غالباً

ستمبر کا آخیر تھا۔

ماجدہ کا بھائی گلی کے موڑ پر ہی مل گیا۔ گھر پہنچکر ہم دیوان خانے میں بیٹھ گئے۔ اختر اور عظمی بھی وہاں آگئیں۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد راجدہ بھی نیچے آکر ہمارے قریب بڑی الماری میں سے کچھ ڈھونڈھنے لگی۔ پھر چائے آگئی۔ چائے کی سبز پھولدار پیالیاں ہاتھوں میں تھامے ہم لوگ گرمجوشی سے باتیں کر رہے تھے۔ کہ باہر ڈیوڑھی میں سائیکل کھڑا کرنے کی آواز آئی۔ سب ایک دم چپ ہو گئے۔ راجدہ کا بھائی زیر لب مسکراتے ہوئے بولا "چچا آرہے ہیں"۔

اور پھر دروازہ کھلا اور ایک چچا نمودار ہوا جس نے نیکر پہنی تھی اور جس کے گندمی چہرے کی کھال کرخت اور کھچی ہوئی سی تھی۔ ایک ہاتھ سے مہندی لگا سر جھاڑتا ہوا ہمارے قریب آکر رک گیا۔ میرا تعارف کرا دیا گیا۔ مگر اس نے میری طرف سرسری انداز میں دیکھا۔ اور بڑی بے نیازی کے ساتھ میری کرسی کے عقب سے ہو کر ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیب سے پاسنگ شو کا سگریٹ نکال کر اس نے سلگایا۔ اور منہ سے دھوئیں کا غبار سا چھوڑتے ہوئے بولا۔

آج کینڈ آدم کی تقریر ہو رہی ہے۔

پہلے تو میں لفظ قاعدِ آدم پر بالکل حیران نہ ہوا۔ کیونکہ اس روز واقعی منٹو پارک میں کندِ آدم کی تقریر ہو رہی تھی۔ لیکن جب بعد میں چچا صاحب کی کارگیری کا احساس ہوا تو میں بمشکل اپنی ہنسی روک سکا۔

ہاں ہو رہی ہے۔ تم بھی چلوگے چچا؟ راجدہ کے بھائی نے کہا۔

پہلے تو چچا آنکھیں ملتا اور جھپکاتا رہا۔ پھر پاسنگ شو کا لمبا کش لگا کر بولا۔

بھئی چلیں گے ضرور مگر شطرنج بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔

حد ہو گئی — چچا وہاں شطرنج کا کیا کام؟ اور چچا پاسنگ شو کی راکھ جھاڑ کر بولا۔ میاں — جب تقریر سنتے سنتے تھک جائینگے تو پھر کیا کرینگے۔ اتنے بھرے مجمع میں سے اٹھ کر چل پڑنا بھی تو مناسب نہ ہوگا۔ اور اگر شطرنج بھی پاس ہی ہوگی تو کیا کہنے ہیں پھر ——— قاعدِ آدم خواہ ساری رات تقریر کرتا رہے۔

اس کے بعد وہ اٹھا اور سر جھاڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

راجدہ کے بھائی نے مجھے بتایا کہ چچا کو شطرنج سے حقیقی عشق ہے اور وہ اکثر یاروں کی ٹولی میں گلی کے کونے پر بیٹھ کر کمیٹی کے لیمپ کی روشنی میں رات رات بھر شطرنج کھیلتا رہتا ہے۔ اور کچھ دیر تک میں راجدہ کے گھر میں بیٹھا راجدہ کے خیال سے بے خبر اُسکے چچا کی دلچسپ شخصیت کے متعلق سوچتا رہا۔ اور جب میں راجدہ کے گھر سے نکلکر گلی میں سے نکل رہا تھا تو مجھے اسکا چچا ایک خالی دوکان میں دکھائی دیا۔ اس کے آگے شطرنج کی بساط پر مہرے بکھرے ہوئے تھے اور وہ ایک ہاتھ سے ٹھوڑی پکڑے اور دوسرا ہاتھ صدری کی جیب میں ٹھونسے مہروں پر جھکا ہوا تھا۔ جیسے وہ خیال ہی خیال میں کسی غیبی آدمی سے بازی لگائے ہوئے ہو۔

دو تین ہفتے گذر گئے اور میں راجدہ کے ہاں نہ جا سکا۔ ایک دن دوپہر کے وقت میں اپنے دیوانخانے میں بیٹھا چند ہی تصاویر کو البم میں لگا رہا تھا کہ ڈاکئے نے راجدہ کا خط چق اٹھا کر اندر پھینکا۔ یہ خط بڑی آپا کو لکھا گیا تھا۔ لیکن اس میں ایک علیحدہ رقعہ میرے نام بھی تھا۔ راجدہ کی طرف سے میرے نام یہ اس کا پہلا خط تھا۔ جیسے

میں نے کئی بار پڑھا اور جس کے مختصر اور پُر محبت الفاظ بہت جلد مجھے ازبر ہو گئے۔ راجدہ نے جواب کے لئے اپنی کسی سہیلی کا پتہ لکھا تھا۔ میں نے اُسی وقت قلم اور کاغذات لئے اور ایک لمبا چوڑا خط راجدہ کو لکھ ڈالا۔ تیسرے ہی روز میرے خط کا جواب بھی آ گیا۔ میں نے اُسی وقت ایک اور خط لکھ ڈالا۔ جس کا جواب بھی تیسرے روز مجھے مل گیا۔ میرے لئے یہ کام راجدہ کو ملنے سے بھی زیادہ دلچسپ اور رومانوی تھا۔ چنانچہ میں نے قصداً راجدہ کے ہاں جانا بند کر دیا۔ اب اُس کے خطوط میں خطرناک حد تک پہنچی ہوئی بیقراری اور بے چینی کا اظہار ہوتا تھا۔ ایک خط میں لکھا آیا۔ "میں بیمار ہوں"۔

اب میرے لئے مزید رُکنا محال تھا۔ دوسرے ہی روز میں راجدہ کے ہاں نچلے کمرے میں بیٹھا اختر اور عطی سے باتیں کر رہا تھا۔ دراصل راجدہ بیمار نہیں تھی۔ یہ محض مجھے بُلانے کے لئے ایک چال چلی گئی تھی۔ جس میں اختر بھی شامل تھی۔ بطور احتجاج میں راجدہ سے بالکل نہ بولا۔ پہلے پہل تو وہ میری اس ناراضی کو عارضی سمجھتے ہوئے مجھے بات بات پر چھیڑتی اور مذاق کرتی رہی۔ لیکن جب میری خاموشی لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی گئی تو وہ پریشان سی نظر آنے لگی۔ باہر گلی میں عورتوں کے درمیان کچھ جھگڑا سا کھڑا ہو گیا۔ اور عطی اور اختر جلدی سے کھڑکیوں کی طرف بھاگ اُٹھیں۔ کیونکہ ایک عورت نے دوسری کو بڑی پھبتی ماں گالی دے ڈالی تھی۔ راجدہ موقع پا کر میرے قریب آ گئی۔

کیا ہو گیا ہے؟

میں خاموش رہا۔

"کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معافی مانگتی ہوں"۔

"کچھ بھی نہیں ہوا"—— میں نے گیرے گرانٹ کے انداز میں کہا۔ وہ فلم "نوٹوریس" میں انگرڈ برجمین کو اسی انداز میں کہتا ہے۔ یہ فلم میں نے اُسی روز ریگل میں دیکھی تھی۔ راجدہ اگر انگرڈ برجمین ہوتی تو اپنے خاص انداز میں ٹیبی اور گداز بانہیں میرے گلے میں ڈال دیتی اور گیرے گرانٹ کی ساری خفگی دُور ہو جاتی۔ مگر اُس بیچاری کو برجمین کے منانے کے انداز کی کیا خبر تھی۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے اُلٹا زیادہ پریشان ہو گئی۔ گلی والا جھگڑا ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اور عطی اور اختر اندر آ رہی تھیں۔

"بڑی بدمعاش ہے یہ"۔ اختر نے عطی سے کہا۔ اور اُس نے ہاں میں ہاں ملا دی۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئیں۔ راجدہ اُٹھی اور اُوپر چلی گئی۔ میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ وہاں اور بیٹھا رہا۔ لیکن راجدہ بالکل نیچے نہ اُتری۔ عطی آرام کرسی پر نیم دراز تقریباً سو رہی تھی۔ اختر کروشیا کاڑھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ راجدہ ناراض کیوں ہے؟ اُس نے کہا۔ خود ہی پوچھ لو۔ اوپر ہو گی، اور مُسکرانے لگی۔ میں ایک لفظ کہے بغیر اوپر چلا گیا۔

راجدہ درمیانی منزل میں پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کا مُنہ دیوار کی طرف تھا۔ میں نے قریب جا کر اُسے پکارا۔ کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"راجدہ! میں یہاں نہ آیا کروں؟" میں نے محسوس کیا۔ کہ راجدہ کا جسم ہولے ہولے ہل رہا تھا۔

"اگر تم یہی چاہتی ہو۔ تو خدا کی قسم میں بنا آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تُم سے چھپا لوں گا"۔ راجدہ خاموش رہی۔ میں نے کندھے سے پکڑ کر اُس کا مُنہ اپنی طرف کر لیا۔ راجدہ رو رہی تھی۔ گھنی پلکوں کی خنک چھاؤں میں بارش کی جھڑی لگ رہی تھی۔ رِم جھم رِم جھم —— اور سیاہ پتھروں کی چکنی سلوں پر سے پانی کے شفاف قطرے ڈھلک ڈھلک کر پھیل

رہے تھے ۔۔۔ ”روندے پتھر پہاڑاں دے“

چند لمحات کے لئے ہم خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے کو تکتے رہے ۔ بے زبان اور مسحور ۔۔۔۔ جیسے ہمیں جادو کی چھڑی چھو گئی ہو ۔ راجدہ کے آنسو نہیں تھمتے تھے ۔ میں نے آہستہ سے راجدہ کی گرم پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔

میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا راجدہ ، زندگی کے ہر دَور میں تمہارے ساتھ رہوں گا ۔ وعدہ کرتا ہوں ۔

اور جلدی سے اُٹھ کر نیچے چلا آیا ۔ پچھلے کمرے میں عظمیٰ بدستور چھوٹا سا مُنہ کھولے سو رہی تھی ۔ اور اختر سگریٹ سلگا رہی تھی ۔ اُس نے مُسکراتے ہوئے مجھے دیکھ کر پوچھا ۔

’پُوچھ آئے کیا؟‘

’بچیتہ بہت ہے بھابی‘ ۔ میں نے سگریٹ کیس جیب میں ڈالتے ہوئے کہا ۔

”چلے“ ؟ اختر نے آنکھیں اُٹھا کر پوچھا ۔

اور کیا ۔۔۔۔ گلی میں سے گذرتے ہوئے میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا ۔ تو راجدہ کھڑکی میں کھڑی مُسکرا رہی تھی ۔ لیکن اُس کی آنکھیں بدستور سوجھی ہوئی تھیں ۔

۔۔۔۔ راجدہ کے گھر میں داخل ہو کر ایرانی قالین پر نیم دراز ۔۔۔۔ محبّت اور تسکین سے پُر لمحات کے درمیان ، کارنس پہ آویزاں ٹنگی ہوئی مشرقی تمدّن کی تصویر کو گھورتے ہوئے میں نے کئی بار شیراز کے چمکتے ہوئے نیم روشن بازاروں ، دوہرے ہرے شاداب باغوں اور پُر اسرار قہوہ خانوں کی سیر کی ۔۔۔۔ قہوہ خانے ، جہاں ایران ، مصر اور شام کی زہرہ جمال دوشیزائیں سوڈانی دف بجاتے ہوئے محوِ رقص تھیں ، اور ہرے بھرے باغات کا پُرسکوں سلسلہ ، جہاں نازک اور خوبصورت روشوں کے اِدھر اُدھر جابجا دلکشش فوارے چاندی ایسا پانی اُگل رہے تھے ۔ اور جہاں شیریں میووں سے لدے پھندے درخت تھے ۔ اور جن کے عقب میں نیلے اُفق پر شیراز کی مسجدوں اور خانقاہوں کے دودھیا گنبد ۔۔۔۔

تنہائی اور خاموشی کے یہی وہ لمحات ہوا کرتے جب مجھے ہر اندھیرے کی تہہ میں سے روشنی کے ننھے مُنّے آثار سے پھُوٹتے دکھائی دیتے اور مجھے کئی بار یُوں دکھائی پڑتا جیسے کوئی غیر مرئی شئے روشنی کا دیا لئے تاریکی کے خوفناک سمندر کو چیرتی سربفلک لہروں میں کبھی ڈوبتی ، کبھی اُبھرتی آہستہ آہستہ ، قدم بقدم میری طرف بڑھ رہی ہو ۔۔۔۔

تنہائی روشنی ہے ۔۔۔۔ اور راجدہ کے تصوّر میں ڈوب کر میں اس روشنی سے کئی بار چندھیا کر رہ گیا ۔ راجدہ کا خیال مجھے سب سے الگ ہو جانے پر مجبور کر دیتا تھا ۔ اور سب سے الگ ہو کر میں کئی بار راجدہ کے خیال سے بھی آگے نکل گیا تھا ۔ راجدہ کا تصوّر مثل ایک پُل کے تھا ۔ جو خاموشی اور تنہائی کی اتھاہ خلیج پر پھیلا ہوا تھا ۔ اور جسے عبور کرنے پر میں اپنے تئیں ایک انوکھی ، روشن اور اَن دیکھی دُنیا میں پاتا تھا ۔ جہاں سوائے چمکیلے اُفق ، دودھیا گنبدوں اور اُبھر اُبھر کر ڈوبتی ہوئی لمبی لمبی سوگوار تانوں کے اور کچھ بھی نہ تھا ۔۔۔۔ سلسلہ در سلسلہ ، وجدانی تاثرات میں ڈوبے ہوئے نُورانی لمحات کے منوّر نکتے تھے ۔ جن کا راجدہ سے کوئی تعلق نہیں تھا ۔ اور جنہیں میں راجدہ سے الگ بھی نہیں کر سکتا تھا ۔

نومبر ختم ہو رہا تھا ۔ رات کو اچھی خُنکی ہو گئی تھی ۔ اور دن کو لوگ دھوپ اور چھاؤں کے سنگم پر چلتے تھے ۔ ایک شام دفتر سے گھر لوٹتے ہوئے دل غیر معمولی طور پر اُداس تھا ۔ ایک تو راجدہ کو دیکھے ہفتہ ہو چلا تھا ۔ اور دوسرے کچھ فضا کا بھی

اثر تھا۔ اپنی گلی میں پہنچتے ہی مجھے یونہی خیال آیا۔ اگر گھر راجدہ بیٹھی ہوتی ہو تو؟ ——— تو پھر؟ ——— لیکن میں نے جھک ماری تھی۔ اور میں ہنسنے لگا۔ مگر گھر پہنچکر جب راجدہ کو دیکھا تو میرا دل اُچھل کر میرے مُنہ کے قریب آگیا کیا یہ جھک ماری گئی تھی یا خدا نے میری دُعا قبول کی تھی یا راجدہ کی محبت نے مجھے گلی میں ایسا سوچنے پر مجبور کیا تھا؟

راجدہ باورچی خانے میں اُمی اور آپا کے درمیان بیٹھی تھی۔ اُس کی پیشانی پر سونے کا چھوٹا سا جھُومر لیمپ اور جلتی ہوئی آگ کی روشنی میں جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کا چہرہ کھِل سا گیا۔ جیسے دھنک کے رنگ کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا اچانک سُورج کے سامنے آگیا ہو۔ اُس نے شرما کر سر جھکا لیا۔ اور میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ گھر میں راجدہ کے ساتھ آیا ہوا کوئی محافظ دِکھائی نہ دیتا تھا۔

'تم اکیلے کیسے آگئیں'؟

'اکیلی تو نہیں آئی' بڑی آپا نے کہا۔ خالہ کے لڑکے کے ساتھ اپنی خالہ سے مِلنے آئی تھی اور - - - - -

راجدہ نے آپا کا جُملہ کاٹتے ہوئے کہا۔

. . . . اور میں نے سوچا آپا اور امی کو بھی مِل آؤں' ——— کس قدر شیریں تھا اُس کا لہجہ ——— جیسے میٹھے پھلوں سے لدی ہوئی ڈالیوں پر بارش کے پہلے قطرے گر رہے ہوں۔

گلی میں ایک جگہ اُس رات قوالی تھی۔ جس جگہ یہ محفل منعقد ہونیوالی تھی۔ اُس کے عین اوپر آپا کی ایک سہیلی کا مکان تھا۔ بچے اور چھوٹی بہن تو سر شام ہی اُس مکان میں پہنچ چکی تھیں۔ امی اور آپا وغیرہ میرے کھانے کا انتظار کر رہی تھیں۔ کھانے کے بعد میں نے سیر کی تجویز پیش کر دی۔ آپا اور امی نے کہا۔ بھئی ہم تو نہیں جائیں گے تم دونوں ہو آؤ ——— راجدہ بخوشی تیار ہو گئی۔

جب ہم دونوں نیچے اُترنے لگے تو اُمی بولیں۔

'بھئی جلدی پلٹنا، راجدہ کو قوالی بھی سُننی ہے'،

راجدہ اور میں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے۔ فکر نہ کرو اُمی ——— ہم ابھی آئے'۔

نیم روشن گلیوں اور بارونق بازاروں کو خاموشی سے عبور کرنے پر جب ہم کمپنی باغ والی کھُلی سڑک پر آگئے تو میں نے راجدہ سے پُوچھا۔

'یہ خالہ زاد بھائی کون ہے'؟

'بڑا اچھا لڑکا ہے سچ ——— اُسے ہماری محبت کا علم ہے۔ اُس کی بھی ابھی ابھی شادی ہُوئی ہے۔ وہ دونوں ہماری طرح ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ دونوں نے شادی تک بڑے بڑے دُکھ اُٹھائے ہیں۔ اِسی لئے تو وہ مجھے خود یہاں تک چھوڑنے آیا تھا۔ شاید پرسوں مجھے لینے پھر آئے۔ اور اُس کی بیوی تو اُس سے بھی زیادہ پیاری اور دردمند ہے'۔

'راجدہ! مجھے یقین نہیں آرہا۔ کہ ہم اکیلے سیر کرنے جا رہے ہیں۔ کاش کمپنی باغ کبھی نہ آئے'۔

اور راجدہ ہنس پڑی۔

کمپنی باغ نہیں آئے گا۔ تو پھر ہم سیر کہاں کریں گے'؟

اور کمپنی باغ آگیا۔ جب ہم اُس پلاٹ کے قریب سے گذرے جہاں سُرخ روشوں پر گلابی اور زرد رنگ کے گلاب کے پھولوں کی بیلیں اپنا پُرسکوں سایہ کئے تھیں۔ تو راجدہ بولی۔

"وہ شام یاد ہے نا!"

'ہاں راجدہ، وہ شام مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ وہ ہماری محبت کی اوّلین شام تھی۔ اور اُس کا نقش بڑا گہرا اور دیرپا ہے۔ اُسی شام ہماری محبت نے ان رنگ برنگ پھولوں اور پتوں کے درمیان اپنی آنکھیں کھولی تھیں اس مرطوب سبزہ زار میں —— اور اسی جگہ میں نے پہلی مرتبہ تمہارے گرم پسینے کی خوشگوار بُو سونگھی تھی۔ جس میں حنا کی خوشبو بھی شامل تھی۔

'آج راجدہ نے مُنہ سکیڑ کر کہا۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔

تم نہیں جانتیں راجدہ! یہ میری اپنی باتیں ہیں۔ تم محض سُنتی جاؤ۔ تمہیں کیا خبر میری محبت بیک وقت کہاں کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اور کہاں جا کر ختم ہوتی ہے۔ یہ بہار کے پھولوں کی مانند مجھے اپنے جسم کے ذرّے ذرّے سے پھوٹتی معلوم ہو رہی ہے۔ اور میں نہیں جانتا ان پھولوں کا انجام کیا ہوگا!

راجدہ خاموشی سے میری باتیں سُنتی گئی۔ ہم ایک ایسی سڑک پر سے گذر رہے تھے۔ جس کی دونوں طرف جامن کے سایہ دار درخت تھے۔ اور بجلی کے لیمپ کافی جگہ چھوڑ کر لگائے ہوئے تھے۔ چلتے ہوئے کبھی ہم اندھیرے میں گھر جاتے اور کبھی روشنی میں نکل آتے۔ ہوا کے نرم جھونکے ہمارے قریب سے کبھی رات کی رانی، اور کبھی چنبیلی اور گلاب کی خوشبو لئے گذر جاتے اب فضا میں خنکی بڑھنے لگی تھی۔

'راجدہ سردی تو نہیں لگ رہی؟'

بالکل نہیں —— آج تو میرے ہاتھ بھی گرم ہیں۔

یہ محبت کی گرمی ہے راجدہ، میں نے اُس کے نرم و نیم گرم ہاتھ دبا کر کہا۔ اور راجدہ مُسکرانے لگی۔

ہم جم خانے کے قریب سے گذر رہے تھے۔ مگر راجدہ کے سُنہری جھومر کی چمک یہاں اور تیز ہو گئی تھی۔ میں نے اُسے بتایا اور ایک کلب گھر کے قریب سے گذرتے ہوئے ہمیں مردوں کے قہقہوں اور بلیرڈ کی چھڑی کے گیند سے ٹکرانے کی آوازیں سُنائی دیں۔

گنبد والے پلاٹ کے بعد تک بزی میں خبریں سُنائی دے رہی تھیں اور پلاٹ کے بنچوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اُٹھنا شروع ہو گئے تھے۔ بہار کی بھیگی رات کے گہرے نیلے آسمان پر ستاروں کے کافوری فانوس جا بجا روشن تھے۔ ایک طرف سات ستاروں کی نوری سنہرے کے چھریرے درختوں پر سے جھانک رہی تھی۔ جب تم لوگ سنتے گذر کر اپنے لیے وہ پلاٹ تلاش کرتے میں آ بیٹھے۔ یہ پلاٹ کی عام سطح سے نیچی تھی۔ اور حوض کی مانند بنی ہوئی تھی۔ جہاں نیم باریک نصف دائرے کی شکل میں پھولوں والے پودوں کی کیاریاں تھیں۔ جن میں قرمزی، نیلے، گلابی، زرد، سفید اور کاسنی رنگوں کے گہرے رنگ کے چھوٹے بے شمار پھول کھلے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی نہر کی طرف سے کناروں پر اُگی ہوئی بھنگ کی تیز اور مرطوب بُو آ جاتی تھی۔ سامنے والے باغ میں آڑو اور آلوچے کے درخت تھے جو سفید شگوفوں سے لدے ہوئے تھے۔ کلب گھروں کے روشن

میں سے نیند روشنی جھانک رہی تھی۔ دفعتاً نہر والے درختوں کے عقب میں مدھم روشنی کا غبار سا اُٹھا جو لمحہ بہ لمحہ پھیلتا گیا۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد درختوں کے اوپر زرد چاند کا پژمردہ چہرہ نمودار ہو گیا ——— اس کی سوگوار چمک میں باغ کی ہر شے افسردہ اور ملول سی نظر آنے لگی۔ اِدھر اُدھر پھیلے اشجار کے ذخیروں میں پرندوں کی پیاری پیاری آوازیں بلند ہونے لگیں۔ جیسے وہ چاند کے استقبال کا گیت گا رہے ہوں۔ ساجدہ سیاہ برقعہ میں اپنا آپ لپیٹے مرمریں بنچ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اور اس کا سر میرے زانو پر تھا۔ اور میری انگلیاں اُس کے سُنہری جھومر سے کھیل رہی تھیں۔ جو صندلی چاندنی میں، شام کے ستارے کی مانند کبھی نیلی اور کبھی سُرخ چمک دے رہا تھا۔ راجدہ نے میری طرف آنکھیں اُٹھا کر کہا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے"۔ اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"مجھ سے"

ہاں ——— کہیں تم مجھ سے محبت کرنا چھوڑ تو نہیں دو گے؟

"کبھی نہیں راجدہ"

"سچ ——— میں اُس وقت مر جاؤں گی"

"او ——— کبھی نہیں، کبھی نہیں راجدہ، اور میں نے شام کے ستارے کو چوم لیا۔ اور پھر راجدہ کے نرم بالوں سے کھیلتے کھیلتے، راجدہ سے بے خبر، میں اپنی تنہائی اور خاموشیوں کے ڈونگے سمندروں کی نچلی تہوں میں اُتر گیا۔ اور وہاں میں نے سیاہ پتھروں کی درزوں میں ایسے انمول موتیوں کی ڈھیریاں دیکھیں جو دُنیا کی کسی کان میں نہ تھے۔ اور چکیلی بیلوں پر جھومتے ہوئے ایسے پھول دیکھے۔ جو دُنیا کے کسی باغ میں نہ تھے۔

ہم پلاٹ سے نکل کر سڑک پر آئے تو ہال دروازے والی گھڑی نے رات کے گیارہ کا گجر بجایا۔ اب ٹھنڈی ہوا سارے باغ میں چل رہی تھی۔ اور چاند کافی اوپر آ گیا تھا۔ ہمارے سامنے سڑکوں پر دُور تک درختوں کے جھومتے ہوئے سایوں کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ ہمارے کپڑے اوس میں نم آلود تھے۔ راجدہ کا سیاہ نقاب ہوا میں لہرا رہا تھا اور وہ خود یوں چل رہی تھی جیسے ابھی ابھی ہلکی شراب کا ایک پیگ لگا کر اُٹھی ہو۔

جس وقت ہم اپنی گلی میں پہنچے تو قوالی ہو رہی تھی۔

راجدہ کو بڑی آپا اور امی کے پاس پہنچانے کے بعد میں نے سگریٹ سُلگایا اور اپنے دوستوں کی ٹولی میں جا بیٹھا ابھی میں پہلا ہی کش لگا رہا تھا۔ کہ خوبصورت قوال نے مجھے نیم وا نگاہوں سے دیکھ کر مصرعہ اُٹھایا۔

ع سہانی رات تھی اور پُر سکون زمانہ تھا۔

معاً مجھے محسوس ہوا۔ کہ وہ میری اور راجدہ کی ملاقات کا حال بیان کرنے لگا ہے۔ جیسے وہ ابھی کہیگا۔ سہانی رات تھی۔ اور پُرسکون زمانہ تھا۔ اور راجدہ اپنا سر اپنے محبوب کے زانو پر رکھے کمپنی باغ کے پلاٹ میں لیٹی ہوئی تھی۔ وہ دونوں ابھی ابھی کمپنی باغ سے واپس آئے ہیں۔ راجدہ اوپر چلی گئی ہے اور اُس کا محبوب وہ سامنے بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے ——— میں گھبرا سا گیا۔ ——— مگر خیریت گذری دوسرا مصرعہ کچھ اور تھا۔

———

صبح نہایت روشن اور شاندار تھی۔ نیلے اور پُرنور آسمان پر سپید سپید کبوتروں کی ٹولیاں چکر لگا رہی ہیں۔ راجدہ دیر تک سوتی رہی۔ اس دوران میں، میں صبح کی سیر سے واپس آ چکا تھا اور میرے ہاتھ میں اصلی گلاب کے شبنم آلود سُرخ پھول تھے۔ جن سے بڑی فرحت بخش شیریں خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ میں دبے پاؤں راجدہ کی طرف گیا۔ وہ گرم چادر میں منہ سر لپیٹے بے سُدھ پڑی تھی۔ میں نے آہستہ سے چادر کھسکائی اور پھول اُس کے منہ پر ڈال دیئے۔ اور تیزی سے باہر آ گیا ——— تھوڑی دیر بعد وہ پھولوں کا گلدستہ پکڑے۔ نیند میں شرابور نیم وا آنکھیں لئے، رومال سے منہ پر پڑی ہوئی شبنم پونچھتی باورچیخانے میں داخل ہوئی۔ جیسے وہ بہار کی دیوی ہو اور اپنے عہدِ محبت کی نشانی لئے خیابانوں سے رخصت ہو رہی ہو۔

"پھولوں کی شہزادی" چھوٹے بھائی نے کہا۔ وہ پچھلے روز اسی نام کی ایک کتاب اسکول سے لایا تھا۔

امی، بڑی آپا، اور چھوٹی بہنیں ہنس پڑیں۔ اور چھوٹا بھائی اور راجدہ شرما گئے۔ باورچی خانہ چونکہ کافی کھلا اور روشن تھا۔ اور موسمِ سرما کی بھی آمد آمد تھی چنانچہ صبح کی چائے یہیں اُڑا کرتی تھی۔

بھئی خواہ کچھ ہو، میں تو راجدہ کو اپنے پاس ہی لے آؤں گی۔ امی نے راجدہ کے پیالے میں ملائی ڈالتے ہوئے کہا۔

راجدہ نے سر جھکا لیا۔ آپا بولیں۔

کیوں نہیں ...... اس سے زیادہ اچھی بھابی ہمیں کہاں ملے گی؟ اور راجدہ نے شرما کر دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا۔ اس کی خوبصورت مخروطی انگلیوں میں سُنہری انگوٹھیوں کے سفید نگینے آگ کی روشنی میں دمک اُٹھے اور پھر جیسے باورچی خانہ حجلۂ عروسی میں بدل گیا۔ اور ایک نیم روشن خوشبوؤں بھرے کمرے میں، سیج پر چنبیلی اور موتیا کے بیشمار پھول بکھر گئے۔ دلہن کا سُرخ جوڑا پہنے، سنہری جھومر پیشانی پر لگائے، سولہ سنگار سے آراستہ ہو کر سیج پر چھوئی موئی بنے بیٹھ گئی۔ اور میں سیج کے قریب آیا۔ اور راجدہ نے جلدی سے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ اور اس کی حنائی مخروطی انگلیوں میں انگوٹھیوں کے نگینے ستاروں کی مانند دمکنے لگے اور امی نے کہا۔

بیٹے کہیں تک کرنی کام کرے۔ امی کا یہ جملہ ایسا کسی جھیل میں پھینکا ہوا پتھر تھا۔ جو میرے سنہری خواب کی لہروں کو مجھ سے دُور لے گیا۔ اور میں پھر باورچی خانے میں تھا۔ امی میری پیالی میں چائے ڈال رہی تھی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد، میں، راجدہ اور بڑی آپا دیوانخانے میں بیٹھے تھے۔ آپا گلی والی کھڑکی کے چق کے قریب بیٹھی سویٹر بُن رہی تھی۔ اور راجدہ میری میز کے قریب آرام کُرسی پر نیم دراز نغمۂ حرم پڑھ رہی تھی۔ میں سگریٹ سلگائے کبھی کچھ لکھ رہا تھا۔ اور کبھی راجدہ کے چہرے کو تکنے لگتا تھا۔ جہاں اختر شیرانی کی نظموں کا مطالعہ ایک دلفریب حُسن پیدا کر رہا تھا۔ بڑی آپا بولیں۔

چلو راجدہ ——— فہمیدہ سے مل آئیں،

فہمیدہ بڑی آپا کی گہری سہیلی تھی۔ اُن کا مکان گلی ہی میں تھا۔ اور اُس نے راجدہ کو آ کر مل جانے کا پیغام بھی بھیجا تھا۔ راجدہ تیار ہو گئی اور میں نے قلم میز پر رکھ دیا۔

جلدی لوٹ آؤں گی، راجدہ نے برقعہ پہنتے ہوئے کہا۔ میں نے دراز میں سے موم بتی نکالی اور اسے روشن کر کے میز پر لگا دیا۔ اسے بجھنے مت دینا، راجدہ ہنس پڑی۔

یہ تو آدھی بھی ختم نہ ہو گی۔ کہ میں آجاؤں گی، اور یہ روشن موم بتی کو دیکھکر جس تیزی سے آپا کے ہمراہ چق اُٹھا باہر نکلی۔ مجھے یُوں محسوس ہوا۔ گویا وہ فہمیدہ کے مکان کو ہاتھ لگا کر واپس آجائے گی۔ اور مجھے اپنے بچپن کا زمانہ یاد آگیا جب بڑی آپا مجھے بازار سے کوئی شے خرید کر لانے کے لئے بھیجنے لگتی تو وہ زمین پر تھُوک کر کہتی۔

دیکھتی ہوں یہ پہلے سُوکھتی ہے کہ تم پہلے آتے ہو۔

اور میں لپک کر دکاندار کے پاس پہنچتا۔ جلدی جلدی سودا خریدتا اور گھر میں داخل ہو کر سب سے پہلے تھوک کو دیکھتا کہیں سُوکھ تو نہیں گئی حالانکہ بڑی آپا تھوک کو بالکل بھُول گئی ہوتی تھی۔

میز کے کنارے پر ٹکی ہوئی موم بتی لحظہ بہ لحظہ پگھل رہی تھی۔ گرم موم کے ننھے ننھے شفاف قطرے دُلہن کے آنسوؤں کی مانند بہہ رہے تھے۔ سگریٹ سلگائے میں بڑے اشتیاق سے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ میرا سگریٹ بھی موم بتی کے ساتھ ہی سُلگ رہا تھا۔ سگریٹ میں سے نیلے دھوئیں کی پتلی دُبلی لکیر اُٹھ رہی تھی۔ اور موم بتی میں سے ننھا سا شعلہ ——— ایک کے پاس دھواں اور راکھ تھی اور دوسرے کے پاس روشنی اور آنسو ——— موم بتی قریب الختم تھی۔ میں یوں مضطرب اور پریشان تھا۔ جیسے اگر موم بتی بجھ گئی تو پھر راجدہ کبھی میرے پاس نہ آئے گی۔ اور میں اُس کے رُخساروں کے محرابی خم کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔

موم بتی کا زرد شعلہ بھڑکا اور ڈوب سا گیا۔ جس طرح میدانِ جنگ میں ڈھلتی دھوپ کی سُرخی میں کسی سپاہی کے بلند ہوتے ہوئے نیزے کی اَنی ایک دفعہ چمک کر بجھ جائے اور موم بتی بجھ گئی اور راجدہ نہ آئی۔ میں نے سگریٹ کی گردن راکھدان میں مسل کر پرانی موم بتی کی لاش پر نئی موم بتی روشن کی اور سگریٹ سُلگا کر بیٹھا رہا ——— تھوڑی دیر بعد گلی والے دروازے کی چق اُٹھی اور راجدہ جلدی سے اندر داخل ہوئی۔ اُس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ جیسے وہ بھاگتی ہوئی آرہی ہو۔

"ابھی نہیں بجھی؟ دیکھا میں کتنی جلدی آگئی"۔

میں نے راجدہ کو ایک لمحہ کے لئے دیکھا اور چُپکے سے سر جھُکا لیا۔ وہ برقعے کے بٹن کھولتی ہوئی میری طرف بڑھی

چُپ کیوں ہو گئے؟

کچھ نہیں ——— یہ دوسری موم بتی ہے، پہلی بجھ گئی تھی،

"تو اپنی موم بتی کے پیسے لے لو"

یہ اُس نے کچھ ایسے پیارے انداز میں کہا کہ ہم اپنی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔

"سچ بڑے اچھے لوگ ہیں وہ ——— مجھے اُٹھنے ہی نہ دیتے تھے۔ بڑی مشکل سے بھاگ کر آئی ہوں۔

آپا کہنے لگی میں ذرا دیر بعد آؤں گی۔ میں نے کہا بھئی۔ میں تو چلتی ہوں' ———

اس دوران میں راجدہ نقاب ایک طرف رکھ کر کُرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

موم بتی کی نرم روشنی میں اُس کے چہرے کے نقوش بڑی خوبصورتی سے اُجاگر ہو رہے تھے۔ اُس کا چہرہ سُنہری جلد والی ایک کتاب تھا۔ جو محبت بھرے روشن اور مقدس اشعار سے لبریز ہو۔

موم بتی کی دھیمی روشنی میں ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہماری آوازیں ایک دوسری سے ہم آہنگ تھیں۔

اُن لہروں کی مانند جو پُراسرار چاندنی میں بڑی خاموشی سے پُرسکوں ساحلوں کی طرف سمٹ رہی ہوں۔

ایک ہی چشمے سے نکلتی ہوئی دو ندیاں، جو پہاڑی کی مرطوب ڈھلان میں جا کر آپس میں مل کر بہنے لگی ہوں۔ ایک ہی ڈالی کے دو شگوفے، جو ایک ساتھ کھلیں اور جھومیں ایک ساتھ مُرجھا کر جھڑ جاتا ہوں۔

ہم الفاظ کی موسیقی سے کھیل رہے تھے۔ جس طرح موسم بہار میں کم سن بچے پھولوں سے کھیلتے ہیں۔ راجدہ کے چہرے کے گرد روشنی کا پُرنور ہالہ سا تھا اور مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے راجدہ آگ کا ایک تڑپتا شعلہ ہے جو شام کے وقت کسی کھلے میدان کے وسط میں روشن ہو۔

جب ہم خاموش ہو جاتے تو ہمیں اپنے کہے ہوئے الفاظ دیوان خانے کی نیم روشن فضا میں جگنوؤں کی مانند رہ رہ کر چمکتے دکھائی دیتے۔ پھر ہماری گفتگو خاموش اور بے زبان گفتگو میں بدل جاتی۔ ہم ایک دوسرے سے درختوں، پھولوں، ستاروں اور آبشاروں کی زبان میں باتیں کرتے۔

یہ گھنے جنگلات اور تاریک راتوں کی گفتگو تھی۔ جو دن نکلنے پر اپنے پیچھے روشنی اور شبنم کے آنسو چھوڑ جاتی ہے۔ پھر دن نکل آیا اور راجدہ لاہور چلی گئی۔

لاہور پہنچنے کے بعد راجدہ مجھے برابر خط لکھتی رہی۔

جنوری کا اخیر تھا۔ کہ راجدہ کا ایک خط آیا۔

میرے پردیسی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معاف کرنا میں تمہارے خط کا جواب دیر سے لکھ رہی ہوں۔ میرا چچازاد بھائی سعید برما سے اچانک واپس آ گیا ہے۔ اور گھر میں چونکہ رشتہ داروں کی آمد و رفت رہی۔ اس لئے اتنی فرصت نہ مل سکی کہ تمہیں اطمینان سے بیٹھ کر خط لکھتی۔ سچ مجھے بڑا افسوس ہے پتہ نہیں تم کیا خیال کرتے ہوگے . . . .

راجدہ کا اندازہ درست تھا۔ سعید کے بارے میں مجھے طرح طرح کے غیر خوشگوار خیالات نے گھیر رکھا تھا اگرچہ اُس کے متعلق میں اتنا ہی جانتا تھا۔ کہ وہ راجدہ کا چچازاد بھائی ہے اور تین سال سے برما میں ہے۔ پھر بھی میرے کان میں اتنی بھنک ضرور پڑ چکی تھی کہ سعید کی مرحوم ماں راجدہ کو اپنے بیٹے کے لئے مانگ چکی ہے۔ اب مجھے بار بار سعید کا خیال آتا۔ اور ہر بار مجھے یہی محسوس ہوتا جیسے کوئی ان دیکھا ہاتھ بڑی خاموشی سے میرے دل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے خیال ہی خیال میں کئی دفعہ راجدہ کو سعید کے پاس بیٹھے ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا۔

اور ایک ہفتہ بعد جب میں راجدہ کے ہاں گیا۔ تو راجدہ تولیہ اور صابن دانی پکڑے سعید کا مُنہ دُھلا رہی تھی مجھے اچانک اپنے بالمقابل دیکھ کر راجدہ کا چہرہ ایک دفعہ زرد ہو کر جیسے ڈوب سا گیا۔ راجدہ کے بھائی وہیں بیٹھے تھے۔ بعد ازاں میرا تعارف کروایا گیا۔ سعید خندہ پیشانی سے مجھے ملا۔ راجدہ اوپر جا چکی تھی۔ سعید ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ راجدہ کے بھائی کیرم بورڈ کھیل رہے تھے۔ اور میں آرام کرسی میں دھنسا خاموشی سے سگریٹ پی رہا تھا۔ علی اور اختر وغیرہ باورچی خانے میں تھیں کبھی کبھی علی کی دبی دبی ہنسی اور اختر کی گفتگو کی مدھم آواز آ جاتی تھی۔ راجدہ اوپر تھی۔ اور میں کمرے میں خاموش اور اُداس اُداس بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں وہاں کتنی دیر بیٹھا رہا۔ مگر راجدہ ایک بار

بھی پھر میرے سامنے نہ آئی۔

اُس گھر میں سالوں کی گرویدگی اور محبت کے بعد یہ پہلا موقع تھا۔ کہ مجھے وہاں کی ہر شے بیرُخی سے منہ پھیرتی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے میں اجنبی ہوں۔ اور اُن کی منشا کے خلاف وہاں آن بیٹھا ہوں۔

مجھے اپنا جسم خود اپنے آپ پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ معلوم ہونے لگا۔

میں اُٹھا اور چپکے سے ماجدہ کے گھر سے باہر نکل آیا۔

باہر لوگ آ رہے تھے اور جا رہے تھے —— کئی ایک نے میری طرف حیرانگی اور دلچسپی سے دیکھا جیسے میں کوئی بہروپیا ہوں۔ اور بھیس بدل کر اُن کے درمیان آگیا ہوں۔ جیسے وہ مجھے پہچان بھی چکے ہیں اور میرے بہروپ پر حیران بھی ہو رہے ہیں۔ بازار میں چلتے چلتے کئی بار میرے قدم لڑکھڑائے، اور میں گرتے گرتے سنبھلا۔ ایک ہوٹل کے قریب پہنچ کر میں اندر گھس گیا۔ لیکن چائے کا آرڈر دے کر بغیر چائے پیئے باہر نکل آیا۔

میری حالت کسی ایسے گویّے کی سی تھی جو بھری محفل میں گاتے ہوئے اچانک بے سُرا ہو گیا ہو۔

میں امرتسر چلا آیا۔ اپنے دیوانخانے میں پہنچ کر مجھے یُوں محسوس ہوا جیسے میں بیچ بازار میں ننگا ہو گیا تھا اور میرے اوپر کسی نے چادر ڈال دی ہے —— میز پر پڑی ہوئی کتابوں کے پاس پھولدان میں گلاب کے پھول مُرجھا رہے تھے۔ کونے میں میرے چھوٹے بھائی کے ہاتھ سے بنی ہوئی آئل پینٹ تصویر پر گرد سی جم رہی تھی۔ اِس تصویر میں سُوکھے ہُوئے درختوں کی بے برگ ٹہنیوں کے عقب میں بھورے رنگ کے جل تھل کرنے والے بادل اُٹھتے دکھائے گئے تھے اور نیچے لکھا تھا: "ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا........"

میں نے اُس تصویر کو لیکر رومال سے اُس پر جمی ہوئی گرد صاف کی اور میرا دل بھر آیا اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا...... اور میں نے تصویر کو سینے سے لگا لیا۔ کتنی ہی دیر تک ماجدہ کا غم آنسو بن کر میری آنکھوں سے بہتا رہا۔ اور جب میں نے تصویر کو دوبارہ میز پر رکھا تو مجھے اپنا آپ اُس بچے کی مانند مسرور اور ہلکا ہلکا سا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے سکول کے دروازے پر پہنچ کر خبر ملے کہ آج چھٹی ہے ------

دوسرے مہینے کے وسط میں ماجدہ کا خط آیا۔ کہ اُس کے والدین اُس کی شادی سعید سے کرنا چاہتے ہیں۔ اور اُس نے زہر منگا کر اپنے پاس رکھ لیا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

ماجدہ کا ایک اور خط آیا۔

...... خدا کے لئے مجھے بتاؤ۔ میں مر جاؤں گی پردیسی،

میں کیا کرتا —— میں نوکری چھوڑ بیٹھا تھا۔ کس برتے پر ماجدہ کو بیاہتا۔ میں نے امی سے بات کی کہ اگر ماجدہ مجھے مل جائے تو میں نوکری پھر کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ وہ مان گئیں مگر ابا نے کہا۔ کہ وہ لڑکی والوں کو صاف صاف کہہ دے گا کہ لڑکا نکما ہے —— ماجدہ مجھے برابر لکھتی۔ نوکری کر لو۔ پھر ہم شادی کر لیں گے۔ پھر ہمیں دُنیا کی کوئی طاقت جُدا نہ کر سکے گی —— میں نے سر توڑ کوشش کی لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا۔ جب ماجدہ کے بچھڑ جانے کے بعد مجھے ایک کالج کی لائبریری میں پچاس روپوں کی جگہ مل گئی۔ اُس رات خوشی سے میں بالکل نہ سو سکا۔ تمام رات بستر میں لیٹا پیاری کے خواب

دیکھتا رہا۔ راجدہ بھاری کامدار ریشمی لباس میں ملبوس پھولوں میں لپٹی۔ دلہن بنی میرے ساتھ سمٹی ہوئی بیٹھی ہے۔ باریک ریشمی گھونگھٹ میں سے مجھے اُس کے ریشمی رُخسار دمکتے ہوئے معلوم ہو رہے ہیں۔ ہمیں راجدہ کی شریر اور چنچل سہیلیوں نے گھیر رکھا ہے۔ کوئی پان پیش کر رہی ہے۔ اور کوئی دودھ کا گلاس پلانے پر تُلی کھڑی ہے۔ مگر میں انکار کر رہا ہوں۔ کیونکہ مجھے پتہ ہے۔ کہ پان میں سپاریوں کی جگہ روڑے اور دودھ میں چینی کی جگہ نمک کا ڈبہ انڈیل دیا گیا ہے ——

پھر میں نیچے جانے کے لئے اُٹھا ہوں اور میرے ساتھ تکیہ بھی اُٹھ آیا ہے۔ کیونکہ اُسے میرے کوٹ کے ساتھ چپکے سے چمٹا دیا گیا ہے۔ میرا مذاق اُڑایا جا رہا ہے۔ اور میں شرمندہ ہو رہا ہوں۔ میں جوتا ڈھونڈھ رہا ہوں۔ اور جوتا نہیں مل رہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پھر جیسے کمپنی باغ میں پھولوں بھری بیلوں اور گنجان درختوں کی پُرسکون چھاؤں میں راجدہ میرے قریب بیٹھی اون اور سلائیاں لئے کچھ بُن رہی ہے۔ میں گھاس پر نیم دراز ہوں۔ ہمارے پاس ہی ایک بڑی ہی پیاری بچی پھولوں اور گھاس پر گرے پڑے پتوں سے کھیل رہی ہے۔ میں کبھی راجدہ اور کبھی بچی کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ اور آسمان پر موسم بہار کی شام کی سنہری چمک پھیل رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور پھر دن نکل آیا اور اُسی دن میں اُمیدوں اور ارادوں سے بھرپور دل لئے راجدہ سے ملنے گیا۔ ایک بازار کا موڑ گھومتے ہی مجھے سامنے راجدہ کا بھائی آتا نظر آیا۔ مجھے یوں معلوم ہوا۔ جیسے راجدہ خود چلی آ رہی ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں اُسے گلے سے لگا لوں۔ قریب پہنچکر وہ ٹھہر گیا۔

"بھئی کل شام دفتر سے نکل کر گھر ضرور پہنچ جانا"

"کوئی محفل سرود گرم ہو رہی ہے کیا؟ میں نے اپنے جسم میں مسرتوں کے غبارے سے اُبھرتے محسوس کئے"

"یہی سمجھ لو، اُس نے حسب عادت مُسکراتے ہوئے کہا "سعید کا نکاح ہو رہا ہے"

"کہاں؟ میرے مُنہ سے خود بخود نکل گیا۔ لیکن مجھے اب تک یاد نہیں۔ کہ میں نے ایسا کہا ہو۔

"گھر ہی میں —— ویسے تم ضرور پہنچ جانا"

"ضرور ——" اور وہ چلا گیا۔ اور مسرتوں کے غبارے یکے بعد دیگرے پھٹتے چلے گئے اور میں نہ راجدہ کے گھر کی سمت بڑھ سکا۔ اور نہ وہاں کھڑا ہو سکا —— بازار میں ہر شے سے بے خبر، میں سر جھکائے، ہاتھ لٹکائے یوں چلا جا رہا تھا جیسے اپنے جوان بھائی کو قبرستان میں دفنا کر آ رہا ہوں۔

راجدہ، سعید سے بیاہی جا رہی تھی۔

وحشی اور ظالم لوگوں سے بھری ہوئی ریل گاڑی سے نکل کر میں نے نرم دل گارڈ کے ڈبے میں پناہ لی تھی اور نرم دل گارڈ نے مجھے بڑی محبت سے سگریٹ پیش کرنے کے بعد ڈبے سے باہر نکال دیا تھا۔ اور میں پھر اُنہی لوگوں کے اژدہام میں تھا۔ تنہا اور بے یار و مددگار۔

گھر پہنچکر میں تمام رات سگریٹ پیتا اور بڑے تحمل سے راجدہ کے بغیر بسر ہونیوالی اپنی زندگی کے نشیب و فراز گنتا رہا۔ راجدہ کے بغیر میں اپنی زندگی کا کوئی آخری نقشہ قائم کرنے سے بالکل قاصر تھا۔

کسی وقت مجھے محسوس ہوتا کہ میں کسی اجنبی اور ناواقف شہر کے اَن دیکھے بازاروں میں یونہی آوارہ

اور بے مقصد گھوم رہا ہوں۔ اور لوگ اپنی اپنی دوکانیں اور کاروبار بند کر کے گھروں کو جا رہے ہیں اور کبھی مجھے اپنی دونوں طرف ویران اور اُجاڑ کھنڈرات کا مہیب سلسلہ حدِ نگاہ تک پھیلا معلوم ہوتا اور میں چلا جا رہا ہوں ——کہاں؟ کدھر؟ کوئی خبر نہیں——

راجدہ میرے لئے روشنی کا مینار تھی جیسے دیکھ کر بھولے بھٹکے جہاز ران رستے کی درست سمت اور خطرے سے آگاہ ہوتے ہیں۔ مگر اب اس مینار کی روشنی دُھند کے دبیز غلاف میں لپٹی ہوئی تھی اور مجھے ہر قدم پر خطرے اور گمرہی کا احساس ہو رہا تھا۔ راجدہ کو اپنے قریب پا کر مجھے اپنے تئیں ایک ایسے پہاڑ کا احساس ہوتا جس کی چوٹی پر سُورج طلوع ہو رہا ہو۔ لیکن اب یہ سورج غروب ہو رہا تھا اور میرے دامن کی بستیوں میں شام کے تاریک سائے پھیل رہے تھے۔

راجدہ کا خیال مجھے ہر شے سے الگ تھلگ ہونے پر اُکساتا تھا اور سب سے الگ ہو کر میں کئی بار راجدہ کے خیال سے بھی آگے نکل گیا تھا۔ مگر آج نا اُمیدی اور خاموشی کے اس پل پر میں اکیلا کھڑا، اپنے نیچے بہنے والی تنہائی اور درد کی تاریک خلیج کو تک رہا تھا۔ جہاں راجدہ کی کانپتی ہوئی مدھم سی شبیہہ سُرمئی دھندلکوں میں آہستہ آہستہ تحلیل ہو رہی تھی۔

شام کے وقت میں گھر سے نکلا اور کمپنی باغ کی طرف چل پڑا۔

باغ میں دھوپ ماند پڑ رہی تھی۔ کہیں کہیں ڈھلتے سُورج کی سُرخی درختوں کے تنوں پر چمک رہی تھی ہلکی سرد ہوائیں درختوں پر سے سُوکھے پتے جھڑ جھڑ کر گر رہے تھے۔ سڑک پر گرتے ہی وہ کچھ دُور تک لُڑھکتے اور پھر جیسے بے جان سے ہو کر رہ جاتے۔

پردہ کلب کے پاس سے گذرتے ہوئے مجھے ماجدہ، عظمیٰ اور بھابی اور بچوں کی آوازیں سُنائی دیں۔ جیسے وہ اندر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے ہوں۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ پلاٹ کے وسط والا آم کا گنجان درخت خاموش محافظ کی مانند کھڑا تھا۔ اور زرد زرد گھاس پر خالی ڈبیاں اور چوسی ہوئی گنڈیریوں کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے۔

سڑک پر گرے ہوئے سُوکھے پتوں کو روندتا، میں اُس پلاٹ میں داخل ہوا۔ جہاں ہماری محبت نے پہلی بار رنگ برنگ پھولوں اور پتوں میں اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ یہاں مرجھائے ہوئے پھول پودوں کی قطاریں سر جھکائے کھڑی تھیں۔ چھت والے گلاب کی بیلیں سُوکھ رہی تھیں۔

"راجدہ دیکھ کر چلنا کہیں کانٹا نہ چُبھ جائے۔" یہ بھابی کی آواز تھی۔

"اوئی پانی بڑا ٹھنڈا ہے۔ تم بھی آ جاؤ"—— یہ راجدہ کی آواز تھی —— وہ دونوں ہاتھوں سے ساٹن کی شلوار کے پائینچے اُٹھائے پلاٹ کے پانی میں چل رہی تھی ....

اب وہ میرے قریب کھڑی سینڈل کے تسمے باندھ رہی ہے۔ اور فضا میں اُس کے خوشگوار پسینے اور حنا کی خوشبو پھیل رہی ہے۔ اور وہ بھابی سے کہہ رہی ہے —— سچ مچ تو ایسی راتیں باغوں ہی میں گذارنا چاہتی ہوں۔ بس پائینچے اُٹھائے پانی میں گھومتی پھرتی رہوں۔ اور جب تھک جاؤں تو ....

ہم کرسٹل میں آگئے ہیں۔ اور راجدہ کیبن کے شیشوں میں سے مجھے پہلی بار محبت کی پاک اور بے لوث نظروں سے تاک رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور راجدہ نے نقاب اُٹھا لیا ہے —— کالے نقاب میں اُس کا سپید چہرہ —— جیسے تاریک رات میں کسی خانقاہ کا کھلا ہوا روشن طاق ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

راجدہ کہہ رہی ہے۔

میں ڈرتی ہوں۔ کہیں تم مجھ سے محبت کرنا چھوڑ تو نہ دوگے؟ سچ میں مر جاؤں گی۔'

'او —— کبھی نہیں، کبھی نہیں راجدہ۔'

اور میں غم سے نڈھال سا ہو کر سنگین بنچ پر بیٹھ گیا۔ میرے اوپر گلاب کی پژمردہ بیل کے جھاڑ تھے۔ میں نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ او، راجدہ —— کبھی نہیں، کبھی نہیں، اور پھر رِم جھم رِم جھم —— مدھم بارش کی غمگین موسیقی اور سیاہ پتھروں پر سے رُک رُک کر ٹھہر ٹھہر کر پھسلتے ہوئے پتھروں کے آنسو ——

روندے پتھر پہاڑاں دے

میں پلاٹ سے باہر نکلا تو سرد اور نیلے آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے۔ ہوا تھم گئی تھی۔ اور باغ کے گنجان درخت یوں خاموش اور متفکر کھڑے تھے۔ جیسے وہ بے زبان فرشتے ہوں اور راہ میں کھڑے کسی پیغمبر کے جنازے کا انتظار کر رہے ہوں۔

— — — — — — — —

وقت کا نہ رُکنے والا چکر گھومتا گیا۔

میں نے راجدہ کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ کچھ عرصہ تک راجدہ کے دُکھ بھرے خط مجھے ملتے رہے لیکن میری طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر اُس نے بھی خط لکھنے بند کر دیئے۔ میرا زیادہ وقت لائبریری میں گذرتا تھا۔ دُنیا کے بہترین مصنفوں کی کتابوں نے میرے دل و دماغ کو دلکشی اور سکون عطا کیا۔

قسم قسم کی تصانیف سے بھری ہوئی لمبی لمبی الماریوں کے پاس فاوسٹ، جین ایر، سلامبو اور پیامِ مشرق پڑھتے پڑھتے جب کبھی مجھے راجدہ کا خیال آتا تو میں اپنے آپ سے شرمسار سا ہو جاتا جیسے وہ کوئی لڑائی مار کٹائی والی فلم ہو جسے میں نے کبھی بڑے شوق سے دیکھا ہو —— پھر بھی کسی وقت جب بارش موسلا دھار ہو رہی ہوتی تو میں لائبریری کی بالکونی میں کھڑا نیچے کالج کے پلاٹ میں ننگے پنجروں، سر سبز گھاس اور عشق پیچاں کے کاسنی پھولوں کو دیکھتے دیکھتے محسوس کرتا جیسے راجدہ مجھ سے جدا نہیں ہوئی۔ وہ اب بھی میرے قریب اِس بالکونی میں کھڑی، گرتی بارش میں پلاٹ کا نظارہ کر رہی ہے۔ اور پھر میرا دل راجدہ کی محبت کے غیر فانی جذبات سے مالا مال ہو جاتا۔

انہی لمحات میں مجھے اپنے ارد گرد ننھی اور کم سن پریوں کے نازک پَروں کی نرم پھڑپھڑاہٹ سُنائی دیتی۔ اور میرے دل کے بھی جیسے پَر نکل آتے اور وہ بھی اُن معصوم آسمانی روحوں کے جُھرمٹ میں مل کر مصروفِ پرواز ہو جاتا۔

جنوری کی ایک ابر آلود شام کو —— جبکہ سردی اپنے جوبن پر تھی۔

میں لائبریری سے باہر نکل رہا تھا۔ کہ راجدہ کا بھائی مل گیا۔ گرم سُوٹ میں ملبوس، سگریٹ سلگاتے، اُس نے

گرمجوشی سے میری طرف محبت کا ہاتھ بڑھایا۔

"کہاں رہتے ہیں آپ؟ کبھی ملے ہی نہیں مجھی کوئی غلطی ہو۔ ۔ ۔ ۔"

میں نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اُس کے قہقہے کا انداز راجدہ سے کس قدر ملتا تھا —— ایک پل کے لئے میں کائنات کی ہر شے سے الگ ہو کر راجدہ کے خیال میں کھو گیا۔

ہم ایک قریبی چائے خانے میں داخل ہو گئے۔ یہاں کی فضا ہر قسم کے لوگوں اور سگرٹوں کے دھوئیں سے بھری ہوئی تھی۔ ہم نے چائے منگوائی اور کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو مدھم لیمپوں کی بھیگی ہوئی روشنی میں گیلی سڑک پر جا بجا پانی کے گڑھے چمک رہے تھے۔ اور لوگ لمبے کوٹوں اور گرم چادروں میں منہ سر چھپائے جلدی جلدی گزر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ بارش ایک دفعہ ہو کر ہٹی ہے۔ ہم خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ ابھی بمشکل ایک بازار ہی طے کیا ہو گا۔ کہ پھر بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اور جب راجدہ کے گھر والی گلی قریب آئی تو بارش یک لخت تیز ہو گئی۔ ہم لپک کر گلی میں گھسے اور ایک مکان کی ڈیوڑھی میں کھڑے ہو گئے۔ بارش چھپڑ پھاڑ کر شروع ہو گئی تھی۔ ہم رومالوں سے اپنے اپنے کوٹوں پر سے بارش کا پانی پونچھ رہے تھے۔ اور اِدھر اُدھر مکانوں کے پرنالوں میں سے بارش کا پانی ایک مسلسل شور کے ساتھ گر رہا تھا۔ ہوا سرد ہو گئی تھی۔ گلی کے لیمپ کی روشنی گرتی بارش کے دھندلے نقاب میں ماند سی پڑ گئی تھی۔ اور گلی میں اِس سرے سے دوسرے سرے تک دھواں سا اُٹھنے لگا تھا۔ راجدہ کا مکان یہاں سے تیسرا یا چوتھا تھا۔ اُس کے بھائی نے کوٹ کے کالر اُٹھا کر کہا۔

"میرا خیال ہے گھر چلتے ہیں۔ یہاں کتنی دیر تک کھڑے رہیں گے۔"

اُس ابر آلود رات کو، بارش کی لگاتار گونج میں کافی مدت کے بعد راجدہ کو پہلی بار دیکھنے کا خیال مجھے بڑا تسکین دہ محسوس ہوا۔ چنانچہ تیزی سے بھاگ کر ہم راجدہ کے گھر میں داخل ہو گئے۔ دیوان خانے کی بتی روشن تھی اُس نے مجھے نیچے بیٹھنے کو کہا۔ اور خود کپڑے بدلنے اوپر چلا گیا۔ میں نے دیوان خانے کا دروازہ کھولا۔ اور اندر داخل ہو گیا۔

کمرے کی فضا گرم اور بیحد مہربان تھی۔ اور وہاں سگریٹ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کرسیاں آتشدان کے قریب کھسکی ہوئی تھیں۔ اور آتشدان میں لکڑیوں کے جل جانے پر دہکتے ہوئے کوئلوں کی سُرخ لو جگمگا رہی تھی۔ تپائی پر ریڈیو خاموش پڑا تھا۔ قریب ہی راکھدان میں تازہ بجھے ہوئے سگریٹ میں سے دھوئیں کی پتلی لکیر اُٹھ رہی تھی معلوم ہوتا تھا۔ ابھی ابھی کوئی وہاں سے اُٹھ کر گیا ہے۔ کمرے کا حلیہ آج سے کچھ عرصہ پہلے کی نسبت بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ فرش پر دری کی بجائے کافی بڑا ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف پلنگ کے قریب نئی طرز کا سنگھار میز پڑا تھا۔ جس پر ہر قسم کا سنگھار کا سامان چمک رہا تھا۔ سنگھار میز کے کونے میں سعید کی تصویر چاندی کے فریم میں مسکرا رہی تھی۔ پلنگ کے پاس ہی سرہانے کی طرف ایک چھوٹے سے میز پر کچھ کتابیں، پیڈ اور قلم دوات اور ٹیبل لیمپ رکھا ہوا تھا۔ کارنس کی پٹی ہلکے سبز رنگ کی ریشمی چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اور دونوں کناروں پر گلدانوں میں کاغذی رنگین پھول اصلی پھولوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ کارنس کے اوپر وہی شہزادگی کے پرانے دروازوں، لمبے لمبے پُراسرار جالی دار جھروکوں اور مسجد کے دودھیا میناروں والی تصویر لٹک رہی تھی۔ یہ تصویر اور ریڈیو پہلے اوپر ہوا کرتے تھے۔ مجھے

یہ سوچنے میں بالکل دیر نہ لگی کہ یہ کمرہ راجدہ بیگم کا تھا۔ میں نے راکھدان میں سگریٹ مسلا اور ریڈیو کی بتی روشن کردی
لاہور ــــــ دِلّی ــــــ بمبئی ــــــ ریڈیو کی سوئی ڈائیل کا نصف سے زیادہ حصہ طے کر چکی تھی
معاً ایک جگہ میرا ہاتھ خود بخود رُک گیا۔ یہ قاہرہ تھا۔ اور وہاں سے عربی موسیقی کا پروگرام شروع تھا۔
دف بج رہی تھی اور لڑکے اور لڑکیاں مل کر گا رہے تھے۔ گیت کے بول میری سمجھ سے باہر تھے۔ مگر ان کی گہری لمبی ــــــ سوگوار کانپتی ہوئی تانیں دل پر برابر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ یہ تانیں لرز لرز کر دل کی گہرائیوں سے اُٹھتیں۔ اور شعلے کی مانند لپک کر پھیل جاتی تھیں۔ ان میں سادگی، سچائی اور تڑپ تھی۔
جب لڑکوں یا لڑکیوں کی ٹولی اپنے بول ختم کرتی تو دیر تک دف بجتی رہتی۔ جیسے کوئی بدوی کھجور کے درخت کو ہلا رہا ہو۔ اور پکی ہوئی موٹی موٹی کھجوریں زمین پر گر رہی ہوں۔ پھر لڑکیوں کی باریک آوازیں تنی ہوئی کمانوں سے نکلے ہوئے سُنہری تیروں کی مانند اوپر کو اُٹھتیں۔
یہ عرب کی صحرا نادیوں کے گیت تھے۔ جنہیں وہ خاص خاص موقعوں پر گاتی ہیں۔ کبھی چاندنی رات میں کھجوروں تلے ٹھنڈی ریت پر محفلیں جما کر کبھی میدانِ جنگ سے لوٹتے ہوئے اپنے خاوندوں اور بھائیوں کی آمد پر کبھی قاہرہ ریڈیو سٹیشن پر آکر ــــــ
دروازہ کھُلا اور راجدہ کا بھائی اور سعید اندر داخل ہوئے۔ میں نے ریڈیو بند کر دیا۔
سعید بھورے اوور کوٹ میں ملبوس تھا۔ اور راجدہ کا بھائی گرم چادر اوڑھے ہوئے تھا۔
'بڑے دنوں بعد نظر آئے۔ کہیں گئے ہوئے تھے؟' سعید نے میری طرف ہاتھ بڑھا کر پوچھا۔
'جی نہیں۔ یہیں تھا۔ دراصل کام کی زیادتی کے باعث - - - - -
'بہت خوب ــــــ آدمی کام کرتا ہی اچھا لگتا ہے' سعید نے بوڑھوں کی مانند مجھے نصیحت کی۔
راجدہ کا بھائی سنگار میز کے دراز دیکھ کر بولا۔
'بھئی سگریٹ ختم ہوگئے میاں'۔
اور میں نے جیب سے دو بار بیٹر' کا ڈبہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور مجھے راجدہ کا خیال آگیا ــــــ راجدہ کہاں ہے؟ شاید اوپر سو رہی ہوگی۔ اُس نے تو کہا تھا۔ میں زہر کھالوں گی۔ کیا اُسے میرے آنے کی خبر نہیں ہوئی؟
دروازہ پھر کھُلا اور عظمیٰ اور اختر اندر داخل ہوئیں۔ اختر اپنی بچی اٹھائے تھی اور عظمیٰ کے ہاتھ میں سلائیاں اور نصف بُنے ہوئے موزے تھے۔
"کہیں باہر گئے ہوئے تھے کیا؟ عظمیٰ نے کرسی آتشدان کے قریب لاتے ہوئے پوچھا۔
"جی نہیں ــــــ یہیں تھا"
"اچھا"
یہ ذرا سی 'اچھا' کہکر وہ بڑے اطمینان سے موزے بننے لگی۔ جس طرح کوئی بچہ قلم چھڑک کر لکھنے میں مشغول ہو جائے۔ یہ 'اچھا' سیاہی کا ایک دھبہ تھا جو میرے کپڑوں پر چھڑکا گیا تھا۔ اختر اور سعید تیز تیز باتیں

کر رہے تھے۔ راجدہ کا بھائی اختر کی بچی سے کھیل رہا تھا۔ گلی میں۔۔ روشندانوں کے چھجوں پر گرتی بارش کا شور اندر سنائی دے رہا تھا۔ آتشدان میں آگ تیز کر دی گئی۔ عظمیٰ خاموشی سے اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ اور میں کرسی میں دھنسا خاموشی سے سگریٹ پیتے ہوئے اُس کے سنہری بالوں اور سپید چہرے کے باریک خطوط کو آگ کی روشنی میں چمکتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

دفعتاً کالے کمبل میں منہ سر لپیٹے کوئی دروازے میں نمودار ہوا۔ کمبل پر بارش کے قطرے جا بجا چمک رہے تھے سب پلٹ کر اُسے دیکھنے لگے۔ اُس آدمی نے کمبل سے ایک ہاتھ نکال کر اُسے منہ پر سے کھسکایا اور یہ چچا، صاحب تھے۔ چچا اپنی کرنجی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔

باہر بارش نے تو بُرا حال کر دیا ہے۔ اندر کیا گُفیہ میٹنگ ہو رہی ہے؟ میں ہنس پڑا۔ اور کوئی نہ بولا۔ ویسے زیرِ لب سبھی مُسکرا رہے تھے۔ چچا اتنا کہکر سنگار میز کی طرف بڑھا۔ اور اُس کے درازوں میں دیر تک کچھ تلاش کرتا اور کسی نے اُس سے کچھ نہ پوچھا۔ آخر وہ خود ہی عظمیٰ کی جانب مُڑا۔

'بھتیجی لڑکی ——— میں موم بتیوں کا ایک سالم بنڈل لایا تھا۔ اور اسی دراز میں رکھا تھا، غائب کیوں ہو گیا؟' آپ ہی لاتے تھے۔ آپ ہی نے رکھا تھا۔ اور آپ ہی جانیں، عظمیٰ نے موزے بُنتے ہوئے جواب دیا۔ اور چچا زیرِ لب نہ معلوم کیا بڑبڑاتا ہوا پھر اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے لگا۔ سعید بولا۔

'چچا موم بتیوں کی کیا ضرورت ہے؟ چچا خاموش رہا۔ آخر اُسے ایک جگہ موم بتیوں کا سالم بنڈل مل گیا اور وہ کمبل سے منہ سر لپیٹ کر باہر نکلتے ہوئے بولا۔

'ضرورت کیا ہے۔ بجلی بازی لگاتی ہوتی ہے اور تیل ختم ہو گیا ہے۔ وہ باہر نکل گیا اور سب ہنسنے لگے۔

دروازہ کھلا اور ایک دُبلی پتلی سی لڑکی، جس کا قد انار کا بوٹا اور ہونٹ باریک اور رخسار ریشمی تھے۔ دونوں ہاتھوں میں چائے کا ٹرے لئے سنبھل کر قدم اُٹھاتی اندر داخل ہوئی۔ یہ راجدہ تھی۔

راجدہ ——— میری موم بتی، میری انگر تر جبین اور میری چین اَبر اور میرے میدان کی آگ اور میرے پہاڑ کا سورج!

راجدہ نے جھک کر ٹرے میز پر رکھا۔ اور پھلوں سے لدی ہوئی شاخ نے جھک کر زمین کو اپنے شیریں میوے پیش کر دیئے۔ اور ایران کی زہرہ جمال دوشیزاؤں نے اپنے سوڈانی دف اُٹھائے اور قہوہ خانوں کی پُراسرار فضا میں رقص کرنا شروع کر دیا۔ پُرانے قالینوں پر، مومی شمعوں کی دھیمی روشنی میں اُن کے نیم عُریاں ادھ پکے سنہری جسم بیقرار شعلوں میں تبدیل ہو گئے۔ اور کم عمر خوبصورت بچے ترکی میخانوں میں گرم گرم قہوہ لئے اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ شیراز کے باغات میں چاندی کے فوارے اُبل رہے تھے اور مسجدوں کے دودھیا گنبدوں کے اوپر نیلے آسمان پر سپید و بُراق کبوتروں کی ٹولیاں محوِ پرواز تھیں۔ اور ملیار ژی کے خیابانوں میں، پتھریلی شاہراہوں کے دونوں جانب جھکی ہوئی نرم بیلوں پر کاسنی رنگ کے انگوروں کے خوشے پک گئے تھے اور اُن پر سفیدی سی جم رہی تھی۔

گلمرگ کی رنگین وادیوں میں چناروں کی ٹہنیوں پر سُرخ سُرخ شگوفوں کی شمعیں روشن ہو گئی تھیں۔ باغات کے گھنے ذخیروں میں کشمیر کی شوخ و شنگ لڑکیاں سیب کے درختوں پر سے سیب اُتار اُتار کر اپنے ٹوکروں میں رکھ رہی تھیں اور راجدہ نے ٹرے میز پر رکھ دیا۔ راجدہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔ اُس نے کسی سے بات نہ کی۔ اُس نے کسی کی طرف آنکھ نہ اُٹھائی

راجدہ نے لکھا تھا : "میں زہر کھاؤں گی ، اور راجدہ نے زہر کھا لیا تھا۔ چائے کا گرم گھونٹ حلق میں اُتارتے ہوئے میں نے راجدہ کی آواز سُنی۔ وہ اپنی امی کو بُلا رہی تھی اور مجھے یُوں محسُوس ہُوا جیسے وہ خواب کے جزیروں سے مجھے آوازیں دے رہی ہے۔ میرے دل میں ایک اجنبی اور مقدس خیال بجلی کی مانند چمکا اور میرا ذہن چکاچوند ہو کر رہ گیا۔

ایک قسم کی بزرگی، عظمت اور برتری کا خیال۔

جو بھرتری ہری کو گھنے جنگلوں میں اور موسٰے کو آگ کی طرف کھینچتا ہوا لے گیا۔

اور جس نے کالیداس کو میگھ دوت اور ڈانٹے کو ڈیوائن کامیڈی لکھنے پر اُکسایا۔

میں نے سگریٹ آتشدان میں پھینکا اور اس خیال کی تعظیم میں میرا سر خود بخود جُھک گیا۔ جب میں گلی سے نکل رہا تھا تو مجھے یُوں محسُوس ہو رہا تھا جیسے میں صد بہار در آغوش، اقلیمِ محبّت کے سنہری خیابانوں میں داخل ہو رہا ہوں۔ مجھے اپنے آپ پر ایک ایسے بجرے کا گمان ہو رہا تھا جس کے ریشمی بادبان تنے ہوئے ہوں۔ اور جیسے مشرقی ہواؤں کے مہربان جھونکے آہستہ آہستہ دُور ــــ پُرسکون جھیلوں، روشن پہاڑوں اور پھولوں سے ڈھکے ہوئے گمنام جزیروں کی طرف لئے جا رہے ہوں ــ ــ ــ ــ ــ

آج راجدہ کی شادی کو تیسرا سال ہو رہا ہے۔

مگر میری راجدہ اس وقت بھی میرے پاس ہے۔ وہ ازل سے میرے پاس تھی اور ابد تک رہے گی اور اُس کا سعید کی راجدہ سے کوئی تعلق نہیں۔ جس طرح کسی قد آور درخت سے چمٹی ہوئی لچکیلی بیل اُس کی خاموشی میں اپنی غذا حاصل کرتی ہے اُسی طرح میں راجدہ کی محبت سے اپنی غذا حاصل کر رہا ہوں۔

میں اُس کی محبّت کو ہضم کر گیا ہوں اور اُس کے اجزا میرے روح و بدن میں سرائیت کر گئے ہیں۔

سعید کی راجدہ کے تین بچے ہیں اور اب وہ سعید کی راجدہ کم اور اپنے بچوں کی زیادہ ہے لیکن میری راجدہ صرف میرے لئے ہے اور میں ہی اُسکی بے لوث محبت کی تمام جائداد کا واحد مالک ہوں۔ وہ ایک سدا بہار درخت ہے۔ جو مجھے اپنی ٹھنڈی چھاؤں عطا کرتا ہے۔ ایک چشمہ ہے جس کا شفاف پانی محض میری خاطر زمین سے پھُوٹتا ہے اور ایک گمنام وادی جسکے نشیب و فراز صرف میرے قدموں کی چاپ سے آشنا ہیں۔

جب مشرق میں صبح ہوتی ہے تو میں اُسے اپنے ساتھ کرنوں کا تاج پہنے زرّیں تخت پر بیٹھے اوپر کو اُٹھتے دیکھتا ہوں۔ شام کیوقت جب وادیوں پر اندھیرا چھانے لگتا ہے تو ہم پہاڑ پر چڑھ کر دن کی رُخصتی کا گیت ہم آواز ہو کر گاتے ہیں۔

اور جب رات کا جادو پھیل جاتا ہے تو وہ ستاروں کے دریچے کھولکر نورانی راستوں پر سے گذرتی ہوئی میرے پاس آ جاتی ہے اور ہم تمام رات گلاب کے پیالوں میں شبنم کی شراب پیتے ہیں اور ازلی و ابدی محبت کے غیر فانی گیت گاتے رہتے ہیں۔

ہر جگہ، ہر مقام پر ہمارے قدم ایک ساتھ اور ہم آہنگ ہو کر اُٹھتے ہیں۔ اُس کا خیال مجھے اپنے تئیں اُس بادل کا احساس دلاتا ہے جو خشک اور بنجر زمینوں پر بارش کے موتی لُٹانے کے لئے پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے بلند ہوا ہو ــــــ

وہ بوڑھی ہے نہ جوان، کنواری ہے نہ شادی شدہ ــــ اُسے وقت کا بوڑھا ہاتھ کبھی نہیں چھُو سکتا۔ وہ اُس کی دسترس سے باہر، لازوال، اٹل اور غیر فانی ہے۔

وہ ہر لحظہ، ہر گھڑی، ہر پل میرے ساتھ ہے۔ وہ اس وقت بھی میرے دل پر اپنی محبت کے نازک پروں کا سایہ کئے ہوئے ہے۔ جبکہ میں اُس کی داستان قلم بند کر رہا ہوں۔

سعید کی راجدہ سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور میں اُس کے بارے میں کبھی کوئی افسانہ نہیں لکھوں گا ... "

سیف الدّین سیفؔ

غزل

آپ سے پیشتر نہیں آتی
موت، کیا سوچ کر نہیں آتی

میری رخصت کا وقت آپہنچا
تیری صُورت نظر نہیں آتی

یہ ہنسی غیر کا مقدّر ہے
کیا مرے حال پر نہیں آتی

تیری محفل کو دوڑتا ہے خیال
بے خودی راہ پر نہیں آتی

آبھی جاؤ کہ وقت نازک ہے
زندگی لوٹ کر نہیں آتی

عمر کیسے کٹے گی سیفؔ یہاں
رات کٹتی نظر نہیں آتی

قتیل شفائی

کہاں سے کہاں تک

چند لمحوں کے لئے میں نے خریدا ہے تجھے — چند لمحوں کے خریدار سے یوں پیار نہ کر
میرے سینے میں کوئی یاد، کوئی داغ نہیں — میرے سینے میں کسی لمحے کو ضوبار نہ کر
پو پھٹے میں نے ترے گھر سے چلے جانا ہے — میرے معصوم ارادوں کو گنہ گار نہ کر

جانے کیا بات ہے، چھائی تھی اداسی دل پر — اب مجھے تو نے بلایا ہے تو چین آیا ہے
گو مجھے تجھ سے محبت نہیں لیکن پھر بھی — میری آنکھوں نے تری سیج کو دھکایا ہے
یوں چلا آیا ہوں جیسے مجھے آنا ہی تو تھا — یوں چلا جاؤں گا جیسے ترا غم کھایا ہے

بے ارادہ ہی ترے گھر کو چلا آتا ہوں — ورنہ اس دل کو لگے رہتے ہیں سو سو دھڑکے
آتے جاتے مرے احباب مجھے دیکھ نہ لیں — میرے اعصاب پہ طعنوں کی نہ بجلی کڑکے
ٹوک بیٹھے نہ کہیں مجھ سا کوئی بڑھ کے مجھے — یوں تصادم سے مبادا کوئی شعلہ بھڑکے

جا ذرا کہہ دے کہ وہ کل سے نہیں آئے ہیں — اور تو اس کے سوا کوئی بہانہ ہی نہیں
بیٹھنا چاہیں تو کہہ دینا مرے لفظوں میں — آج شاید مرے گھر پر انہیں آنا ہی نہیں
جو بھی آتا ہے وہ میرا ہی پتہ پوچھتا ہے — شہر میں اور کہیں ان کا ٹھکانہ ہی نہیں؟

تابش دہلوی

غزل

دل کو ٹھکرا کے ترا حسن پشیماں ہو گا	آئینہ آئینہ اک دیدۂ حیراں ہو گا
گر سکے گی نہ کبھی تختۂ گل پہ بجلی	آشیانہ جو سرِ صحنِ گلستاں ہو گا
صرف ساحل نہیں آسودۂ ہنگامۂ بحر	میری کشتی کو بھی اندازۂ طوفاں ہو گا
کس میں ہمت ہے کہ ہو سلسلہ جنبانِ جنوں	تیری زلفوں کی طرح کون پریشاں ہو گا
میری حالت میں افاقہ ہو یقینی تو نہیں	یوں تو ہونے کو مرے درد کا درماں ہو گا
اب جنوں پردہ درِ عقل ہوا ہے ورنہ	چاک ہو جانے سے پہلے بھی گریباں ہو گا
دیکھنا اہلِ جہاں داغِ تمنا سے کبھی	جنتِ گم شدہ میرا دلِ ویراں ہو گا
جاں نوازی ہے پتنگوں کے لئے نورِ حجاب	ہائے وہ شعلہ جو فانوس میں عریاں ہو گا

میری کشتی تہہِ گرداب ہے لیکن تابشؔ
ایک اک موج میں خمیازۂ طوفاں ہو گا

عبداللہ ملک

ادب اور فسطائیت

"ہم تاریخ کے نازک ترین دور میں سے گزر رہے ہیں، یہ زمانہ بحران کا زمانہ ہے۔ اور ہر لمحہ یہ بحران شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی شعبہ بھی تو ایسا نہیں جس پر اس بحران اور نزاکتِ وقت کی پرچھائیاں نہ پڑ رہی ہوں۔ ہماری روحانی اور سماجی زندگی بھی خطرے میں ہے، یہ صورت حال صرف سیاسی زندگی میں نہیں ہے۔ بلکہ انسان کی ذاتی اور معاشرتی اقدار بھی خطرے میں گھری ہوئی ہیں۔"

MARX PLANCK نے یہ الفاظ ۱۹۳۳ء کے شروع میں کہے تھے۔ یہ بڑا جان کنی کا زمانہ تھا۔ اقتصادی بحران کے بادل پوری دنیا پر چھا رہے تھے۔ کارخانوں کی چمنیوں سے دھواں نکلنا بند ہو رہا تھا مشینوں کی گڑگڑاہٹ رک گئی تھی۔ بیکاروں کی تعداد ان گنت ہو رہی تھی۔

اس معاشی بحران کے تین برس میں (۱۹۳۰ء - ۱۹۳۳ء) صنعتی پیداوار بہت گھٹ گئی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں پیداوار کم ہو کر ۱۹۲۹ء کے مقابلے میں صرف ۶۵ فیصدی رہ گئی۔ برطانیہ میں ۸۶ فیصدی جرمنی ۶۶ فیصدی اور فرانس میں ۷۷ فیصدی۔ اور اس طرح سے اس عالمگیر معاشی بحران نے ۲ کروڑ ۴۰ لاکھ انسانوں کو بیروزگاری کے اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا۔ یہ صرف صنعتی مزدوروں کی تعداد ہے۔ اس کے علاوہ کروڑوں کسانوں کو بھی اس بھیانک بحران نے فاقہ کشی کرنے پر مجبور کیا۔

اس عالمگیر معاشی بحران نے تمام ممالک کے مزدور، کسان اور نچلے طبقے کے پسے ہوئے عوام پر انقلاب اور بغاوت کے دروازے کھول دیئے۔ چنانچہ تمام دنیا کے سرمایہ دار ممالک میں زبردست عوامی تحریکیں اٹھیں۔ خود اس نیم براعظم ہندوستان میں اس زمانے میں زبردست ہڑتالیں ہوئیں، مظاہرے ہوئے، بھگت سنگھ اور اسکے ساتھیوں نے جنم لیا حتےٰ کہ پوری کانگریس کو اس زبردست جوش کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اور مکمل آزادی کا ریزولیشن پاس کرنا پڑا۔ یہ حالت صرف ہندوستان میں نہیں تھی۔ بلکہ یورپ میں اور بالخصوص جرمنی میں اگر۔ ایک طرف بحران کی شدت تھی تو دوسری طرف عوام میں اس نظام کو بدلنے کا بھی اسی شدت سے احساس تھا۔ چنانچہ جرمنی میں ۱۹۳۲ء میں ریشتاگ کے انتخابات میں ۶۰ لاکھ انسانوں نے کمیونسٹ پارٹی کو ووٹ دیئے۔

مگر سرمایہ دار اور سامراج، اس معاشی بحران اور عوام کے انقلابی تیوروں سے دو طرح چھٹکارا حاصل کرتا ہے۔ ایک راستہ تو فسطائی آمریت کے قیام کا ہے۔ یعنی سب سے زیادہ رجعت پسند، سب سے زیادہ جنگجو قوم پرست، اور سامراجی سرمایہ دار عناصر کی حکومت کا قیام۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ دنیا کو از سرِ نو تقسیم کرنے کے لئے ایک نئی جنگ کا آغاز کیا جائے۔

۱۹۳۰ء کے معاشی بحران سے خوفزدہ ہوکر دنیا کے سرمایہ داروں نے دونوں ہی راستے اختیار کیے۔ ایک طرف جرمنی کا سرمایہ دار تھا، جس نے فسطائی آمریت کی راہ اختیار کی تو دوسری طرف جاپانی سامراجیوں نے جنگ کی ابتدا کی۔

ترقی پسند ادیبوں کی پہلی پود انہی حالات سے متاثر ہوئی تھی۔ اگر ایک طرف یہ لکھنے والے سماج کے اس نظام کو بدلنے کے خواہاں تھے تو دوسری طرف ایسے ادیب بھی جنم لے رہے تھے جو اس دنیا سے اکتا گئے تھے۔ جو آفاقی الجھنوں میں پھنس رہے تھے۔ دراصل یہ زمانہ تھا بھی ایسا ہی۔ حقیقت کچھ اتنی ٹھوس اور تلخ تھی کہ اس سے پنجہ آزمائی کچھ دل گردے ہی کا کام تھا۔ لہٰذا بڑے بڑے ادیب ان حالات میں کنی کترا گئے۔ چنانچہ جب انگلستان کے نئے لکھنے والوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تو MICHAEL ROBERTS نے اس کے مقدمہ میں لکھا تھا

"جو شاعر اپنے ارد گرد کے حالات سے نالاں ہے۔ لیکن اسکے باوجود وہ خود کسی مطمحِ نظر کا مالک نہیں اسکی طنز کی کوئی بنیاد نہیں تو وہ لازماً زندگی سے گریزاں ہوتا چلا جائیگا۔ اور اس کی تحریروں میں ابہام آتا چلا جائے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی تحریریں علم و فضل کا پلندہ تو بن جائینگی۔ اور ایک محدود گروہ ان سے مستفید بھی ہو سکے گا۔ لیکن پڑھے لکھوں کی اکثریت اُن سے حظ نہ اٹھا سکے گی۔ اور یہ شاعر ایک طرف خیالی قاری سے مخاطب ہوگا تو دوسری طرف یہ عوام سے نفرت کرنا شروع کردیگا۔

لیکن اس مجموعے کے لکھنے والے خیالی قاری کے متلاشی نہیں بلکہ جیتے جاگتے انسانوں سے مخاطب ہو رہے ہیں:"

جب نئی پود نے قلم سنبھالا تو وہ کسی اعتقاد کے مالک اور مطمحِ نظر کے حامی نہ تھے لیکن اس حقیقت کا اعتراف ان میں موجود تھا کہ زندگی کا چلن ٹھیک نہیں۔ اس کو بدلنا ہوگا۔ یہ نظام جو بیکاری اور افلاس کو جنم دیتا ہے۔ اور کچھ عرصے کے بعد معصوم انسانوں کو جنگ کے میدانوں میں کٹوا دیتا ہے کوئی صالح نظام نہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء کے بعد کے لکھنے والوں میں زیادہ تر ایسے تھے جو انہی حقائق سے دست و گریباں ہو رہے تھے۔ اور اسی کشمکش کے دوران میں انہوں نے اپنے عقیدے کو تلاش کیا۔ اپنا مطمحِ نظر تراشا اور معاشرے میں اپنا مقام ڈھونڈا۔ اس جستجو اور تلاش میں ایک زبردست حقیقت نے مشعلِ راہ کا کام کیا وہ تھا سوویٹ نظامِ حکومت۔ اس لئے کہ جب پوری سرمایہ دار دنیا معاشی بحران میں پھنسی ہوئی تھی اور اس دنیا میں بیکار انسان ہجوم در ہجوم، کارواں در کارواں پھر رہا تھا تو صرف سوویٹ روس ہی تھا جہاں بھوک، افلاس اور بیکاری حرفِ غلط کی طرح مٹ رہی تھی۔ اس حقیقت نے ان نئے لکھنے والوں کو بہت متاثر کیا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب دوسرا مجموعہ شائع ہوا تو اس کا لب و لہجہ مختلف تھا۔ اس کا عزم پختہ تھا اور بات واضح تھی۔ چنانچہ اس کے مقدمے میں اس تبدیلی کا بھی اظہار کیا گیا۔

"اگر ہم انقلاب کے خواہاں ہیں، اور ہماری ہمدردیاں ان انقلابی طاقتوں کے ساتھ ہیں تو اسکی وجہ یہ نہیں کہ ہمیں بیکاروں اور مفلسوں کے ساتھ بہت زیادہ ہمدردی ہے اور ہم میں رحم کا جذبہ ابھر رہا ہے۔ بلکہ ہماری ہمدردیاں اس لئے انکے ساتھ ہیں کہ انکی لڑائی ہماری لڑائی ہے۔ اور جیسے جیسے ادیب کو یہ محسوس ہوگا کہ اس کے اپنے مفاد محنت کش طبقے سے وابستہ ہیں ویسے ہی اس کی سیاست بھی محنت کش طبقے کی سیاست سے وابستہ ہوتی جائے گی۔ اور اس کا نتیجہ ہوگا کہ اس کی تحریروں سے فرار اور

ابہام دور ہوتے چلے جائیں گے۔

میں انگلستان کی مثالیں اس لئے دے رہا ہوں کہ ہماری نئی پود اور خصوصاً ترقی پسند ادیبوں کی پہلی پود انگلستان کی اسی پود سے متاثر ہوئی تھی۔ انگلستان اور یورپ کے دوسرے ممالک کے ادیبوں کو اس معاشی بحران کے فوراً بعد ہی فسطائی رجحانات اور فسطائی فوجوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اور آج پھر پوری دنیا کو اسی قسم کے تجربات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ اس لئے اس پود کے تجربات ہمارے لئے بہت اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ اس پود کی اچھائیاں مسلمہ ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ اس پود کی کوتاہیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ اسی قسم کی کوتاہیاں ہمارے ہاں بھی ابھر رہی ہیں۔

——— ہاں تو میں انگلستان کے نئے لکھنے والوں کی بات کر رہا تھا۔ ۱۹۳۰ء کی پود میں غصے سے زیادہ امید تھی۔ ان میں جھنجھلاہٹ نہ تھی۔ بلکہ یقین کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ ان سے پہلی پود میں غصہ تھا۔ جھنجھلاہٹ تھی، اور یہ بڑھتے بڑھتے ناامیدی اور قنوطیت کی راہ اختیار کرتی جاتی۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ پرانی روایات کو تابندگی بخشنے کا رجحان ابھرا۔ ہیئت کی محنت مندی کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔

اس کی وجہ نمایاں ہے۔ ۱۹۱۷ء کے سوویٹ انقلاب کے بعد پورے یورپ میں انقلابی تحریکیں ابھریں اور انہوں نے پورے سامراجی نظام کی در و دیوار کو ہلا دیا۔ ان تحریکوں میں جنگ کے مخالف جذبے بھی بہت حد تک کارفرما تھا۔ چنانچہ پورے یورپ میں جنگ کے مخالف ناول اور نظمیں لکھی گئیں۔ کیونکہ وہ تمام ادیب جو اس جنگ میں شریک ہوئے تھے، انہوں نے اپنے ملک کے سرمایہ داروں کے ان نعروں پر یقین کر لیا تھا کہ یہ جنگ آخری جنگ ہے۔ اور اس کے بعد خوشحالی اور فارغ البالی کا ایک نیا دور طلوع ہونے والا ہے۔ لیکن جب ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء میں سوویٹ کے ساتھ دوسرے ممالک میں مزدور اور کسان بندوقیں لیکر اپنے حقوق کے حصول کے لئے میدان میں نکلے تو بھی سرمایہ دار رہنما تھے۔ جنہوں نے اپنے توپ کے دہانوں کو ان معصوم انسانوں کی طرف پھیر دیا۔ اسی حادثے سے یہ پہلی پود بوکھلائی تھی، اور ان میں غصہ اور جھنجھلاہٹ جھلکنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی کچھ ادیبوں میں گریز اور فرار نمایاں ہوا۔

لیکن ۱۹۳۰ء کے بعد تو سیاسی طور پر بھی مزدور اور محنت کش عوام زیادہ منظم اور باشعور ہوتے جا رہے تھے۔ اسی تنظیم اور شعور نے درمیانہ طبقہ کے لکھنے والوں کے سینوں میں امید اور یقین کی مشعل روشن کی تھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جیسے جیسے یورپ میں فاشزم بڑھتا گیا ویسے ہی ان نئے لکھنے والوں میں زیادہ جان اور زیادہ پختگی آتی گئی۔ یہ فاشزم سے لڑنے کے عزم کا اظہار تھا۔ اسکے ساتھ ساتھ ایک طرف اگر یہ ادیب ابھرتے ہوئے فسطائی رجحانات کی پوری ماہیت کو سمجھ رہے تھے۔ تو دوسری طرف محنت کش عوام کے تیور بھی ان کی ہمتیں بندھا رہے تھے۔

چنانچہ نہ صرف انگلستان نہیں بلکہ پورے یورپ میں میونخ تک نئے لکھنے والوں میں ایک زبردست امید جھلکتی ہے۔ اور نئے نظام میں یہی یقین تھا جو یورپ کے بہترین لکھنے والوں کو کتاں کتاں سپین کی پہاڑیوں میں فرانکو کے خلاف لڑنے کے لئے لے گیا۔ اس وقت یہ ادیب اپنے حکمران طبقوں کے ماتھے کے شکنوں

سے بے نیاز ہو کر فسطائیت کے خلاف سینہ سپر تھے۔ انکے حکمران طبقے فسطائیت کے پودے کو سینچ رہے تھے۔ مگر یہ لکھنے والے اس کی جڑیں کاٹ رہے تھے۔ لیکن میونخ کے مقام پر یہ سرمایہ دار۔ یہ حکمران طبقے۔ یہ سامراجی پوری فسطائیت دشمن تحریک کو دبانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کا نتیجہ ناامیدی، پست ہمتی اور مستقبل سے مایوسی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس وقت ان ادیبوں کے ایمان متزلزل ہونے لگے۔ اب ان کا مارکسزم پر سے بھی اعتقاد اٹھتا جا رہا تھا۔ ان کی انقلاب دوستی بھی ہوا ہو رہی تھی۔ ان کی فسطائیت دشمنی بھی اپنی اہمیت کھو رہی تھی۔ اگر ایک طرف بورژوا سیاست کامیاب ہو گئی تھی، تو دوسری طرف یہ درمیانے طبقے کے لکھنے والے ادیب امید کا دامن چھوڑ بیٹھے تھے۔

اس تغیر کی وجوہات کو تلاش کرنا آج ہمارے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ آج ہمارے ہاں بھی ادیبوں کا ایک حلقہ ایسا ہے جو امید کا دامن چھوڑ بیٹھا ہے۔ جو مستقبل سے مایوس ہو رہا ہے۔ جو انسانوں سے متنفر اور حکومت سے خائف ہے۔

یورپ کے ادیبوں میں فاشزم دشمنی مسلمہ تھی۔ یہ ادیب فسطائی رجحانات کی مخالفت تو کر رہے تھے لیکن وہ ان منبعوں پر حملہ کرنے سے گریزاں تھے جن سے یہ رجحانات پھوٹ رہے تھے۔ یہ ادیب فسطائی اور فسطائیت نواز ممالک میں ادب اور تہذیب کی بیخ کنی پر کراہ تو رہے تھے، لیکن وہ یہ چیز پوری شدت سے محسوس نہ کر رہے تھے کہ ادب اور تہذیب اس وقت تک اسی طرح مٹتی رہے گی جب تک کہ سرمایہ داری نظام باقی ہے۔ ہٹلر، فوجو اور مسولینی اس وقت تک جنم لیتے رہیں گے جب تک کہ دنیا میں منافع خوری اور استحصال کرنے والا نظام باقی ہے۔ ہر ادیب یہ بھی محسوس نہ کر سکے کہ کونسا طبقہ زوال پذیر نظام کے خلاف لڑ سکتا ہے۔ یہ ادیب یہ بھی محسوس نہ کر سکے کہ کونسا فکر اس جنگ میں سرمایہ دار نظام کو شکست دے سکتا ہے۔ اس لئے اس کا نتیجہ مایوسی اور پست ہمتی میں ظاہر ہوا۔ اور بہت سے ادیبوں میں تو خود فسطائی رجحانات جڑ پکڑ گئے۔

مگر جب واقعی فسطائی فوجیں اپنے ہتھیاروں سے لیس یورپ پر چڑھنے لگیں۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ پورا یورپ ہٹلر کے پاؤں تلے روندا جائے گا تو اس وقت یورپ کے ادیبوں کی آنکھیں کھلیں۔ ان کی انسانیت دوستی نے نہ صرف اس فکر کو پہچانا بلکہ انہوں نے اس طبقے کی راہنمائی کو بھی تسلیم کیا جو فاشزم، رجعت اور تاریکی کو کامیابی سے للکار رہا تھا۔ اور یہ حیرانی کی بات تھی کہ یورپ کے اکثر ممالک میں عوام نے نہ صرف سیاسی طور پر ہی کمیونسٹ پارٹی اور مزدور طبقہ کی راہنمائی تسلیم کی بلکہ ہر با حس ادیب کو بھی ان ہی صفوں میں جگہ ملی۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ گو بہت سے ادیبوں، کالج کے پروفیسروں اور بعض اہل علم کے لئے یہ نہایت تلخ ہے۔

دوسری جنگ ختم ہو گئی، فسطائیت کے بہت ہی اہم ستون ایک ایک کر کے گر گئے، بہت سے ممالک میں نیا نظام وجود میں آیا۔ جمہوریت کی نئی تشریح ہوئی اور عوامی جمہوریت عمل میں آئی۔ مگر اس کے باوجود شہنشاہیت اور فسطائیت ہنوز زندہ ہیں۔ اور وہ دنیا کو ایک بار پھر جنگ کے شعلوں اور تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دینا چاہتی ہیں۔

اس لئے یہ ضروری ہے کہ آج ہم اپنے اردگرد بھی نگاہ دوڑائیں اور دیکھیں کہ کہیں ہمارے ہاں بھی فسطائی رجحانات تو نہیں ابھر رہے۔ کہیں ہمیں بھی نئے قسم کے ہٹلر، مسولینی اور ان کے کاسہ لیسوں سے پالا تو نہیں پڑنے والا۔ کہیں یہاں پر بھی زبان پر پابندی تو نہیں لگنے والی۔ کہیں یہ دھرتی بھی تو غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد سرمایہ دارن

کی حرص و آز کی آماجگاہ تو نہیں بننے والی۔ یہی سوال ہیں جو ہر سوچنے والے اور لکھنے والے کو پریشان کر رہے ہیں۔ اور جو ادیب پریشان نہیں ہو رہے وہ یقینی طور پر ادب اور زندگی کا ناطہ توڑ بیٹھے ہیں۔

وقار عظیم نے ادب لطیف کے سالنامہ ۱۹۴۸ء میں "ادب اور پاکستانی ادیب" کے عنوان سے ایک مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ اور انہوں نے کچھ اسی قسم کے حالات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"انتشار کی دنیا میں قدروں کا سارا نظام تہ و بالا ہو گیا ہے۔ انسانیت پر وحشت و درندگی کا غلبہ ہے۔ محبت پر نفرت مستولی ہے۔ نیکی پر بدیوں کا پردہ پڑ رہا ہے۔ اور رجعت کی قوتیں ان حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ استحصال مجبوروں اور بے بسوں کی مجبوری اور بے بسی کی بنیادوں پر اپنے ایوان کی تعمیر میں مصروف ہے۔ رجعت پسندی اگر اسی طرح بغیر کسی روک ٹوک کے مصروف عمل رہی تو ساری زندگی پر ان کا قبضہ ہو جائے گا۔"

وقار عظیم نے واقعی ایک باحس ادیب ہونے کی حیثیت سے حالات کا صحیح جائزہ لیا ہے۔ اور آگے چل کر وہ ان حالات کو بدلنے کے لئے بھی کہتے ہیں۔ لیکن آج جو حالات ہیں وہ اس وقت تک نہیں بدلے جا سکتے جب تک کہ موجودہ دور انتشار کی وجوہات نہ تلاش کی جائیں۔ اور اس مخرج کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند نہ کر دیا جائے جن سے نفرت، وحشت، رجعت، اور استحصال کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ کیونکہ جب تک یہ مخرج باقی رہے گا یہ رجعتی رجحانات ابھرتے رہیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ رجحانات ہمارے ادیبوں کا گلا ہی گھونٹ دیں۔ اپنی حقائق پر نگاہ رکھئے کہ آج اس دور وحشت میں کتنے لکھنے والوں کو ان نئے فرائض کا احساس ہوا۔ بلکہ بہت سے لکھنے والے تو خود اسی دور وحشت اور رجعتی رجحانات کا شکار ہو گئے۔ بہر حال ان کے خیالات میں پراگندگی اور انتشار خود جھلکنے لگ گیا۔

اس وقت پوری دنیا ایک بار پھر فسطائی طاقتوں اور ان کے نعروں سے لرزاں و ترساں ہے۔ اور اب ان نعروں کی گونج صرف یورپ کے میدانوں ہی میں نہیں سنی جا رہی بلکہ پاکستان اور ہندوستان کے گلی کوچوں میں بھی حکمراں طبقے اسی قسم کے نعرے لگا رہے ہیں اور عوام کے ایک طبقے میں بھی یہ نعرے مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔

حقیقت میں آج سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام معیشت اتنے گل سڑ گئے ہیں کہ ان کی زندگی کا انحصار ہی فسطائیت کی صورت میں باقی رہتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جو ممالک بھی معیشت کے ان گلے سڑے نظاموں کو سینے سے لگائے رہیں گے آج وہیں یہ فسطائی رجحانات ابھریں گے۔

پچھلے دس برس میں اس نیم براعظم میں کانگرس اور مسلم لیگ نے جو روش اختیار کی آج کے عوام دشمن، رجعت پسند اور فسطائی رجحانات اسی کی کوکھ سے پھوٹے ہیں۔ اور جب اس سیاست نے برطانوی شہنشاہیت سے ناطہ جوڑا تو انہیں دبے ہوئے رجحانات کو ہوا ملی۔ اور آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑے۔ ۱۵ اگست کے سوراج کی جب پہلی کرن پھوٹی تھی تو یہ کوئی نئے اور آزاد دور کا پیام نہ لائی تھی۔ بلکہ یہ اشارہ تھا کہ اس نیم براعظم میں پچھلے دس سال سے جو المیہ کھیلا جا رہا ہے یہ اس کے منتہائے عروج کا اعلان ہے۔

کہنے والے ممکن ہے کہیں کہ یہ تو ایک مخصوص رجحان کا اظہار ہے۔ لیکن ۱۵ اگست ۴۷ء کے بعد کی تحریریں اس بات کی شاہد ہیں کہ تمام انسانیت دوست ادیب جن کا تعلق کسی سیاسی جماعت یا سیاسی فکر سے نہیں ان کو بھی اس

"آزادی" میں کچھ کھوٹ نظر آیا ہے۔ ان کے کام و دہن آج بھی اس تلخی کو محسوس کر رہے ہیں۔ اب یہ ان ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اس تلخی اور اس کھوٹی آزادی کا تجزیہ کریں کیونکہ اس کے بغیر یہ تلخی اور کھوٹ دور نہ ہو سکے گی۔

چنانچہ آج اس دور انتشار نے اگر ایک طرف ادیبوں کے خاص حصے کو متاثر کیا ہے اور ان کو خیر کی اقدار کی حفاظت کے لئے متحرک کیا ہے تو دوسری طرف کھلم کھلا طور پر عوام دشمن رجحانات کی تبلیغ بھی شروع ہو گئی ہے۔

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ جو گروہ خیر کی اقدار کی حفاظت کا خواہاں ہے اس نے بھی حالات کا صحیح جائزہ نہیں لیا۔ اور شدت بحران کا احساس نہیں کیا۔ اگر کیا ہوتا تو یقینی طور پر وقار عظیم جیسی شخصیت خالی خولی وعظوں تک اپنے مقالے کو محدود نہ رکھتے بلکہ وہ اس دور انتشار کی وجوہات کی تلاش کرتے۔ اور ان غلط رجحانات کو متشکل کر کے قاری کے سامنے پیش کرتے۔

کیا یہ واقع نہیں ہے کہ ۱۸۵۷ء کا دور ہمارے ہاں شدت بحران کی وجہ سے ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے، یہ دور بھی دور انتشار تھا۔ لیکن اس دور انتشار نے سر سید، شبلی، نذیر احمد، محسن الملک کو پیدا کیا۔ انکی اہمیت یہ ہے کہ وہ بھی مسلمان تھے۔ اسلام کے نام لیوا تھے۔ لیکن اسکے باوجود ان کا اسلام جمہور کا اسلام تھا۔ اور شبلی اسی لئے دوزخ سے زیادہ جمہوریت کے مبلغ تھے۔ انکو تمام وہی اسلامی شخصیتیں مرغوب تھیں جو جمہوریت کیلئے قابل تقلید تھیں۔ لیکن آج اسلام جمہوریت دشمن رجحانات کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ اس وقت اسلام کی حفاظت کی ذمہ داری گلے سڑے جاگیرداروں اور انکے کاسہ برداروں کے ہاتھ میں ہے۔ اور جب ایک رو بہ زوال طبقہ کسی بھی فکر کو استعمال کرتا ہے تو اس کو وہ اپنے طبقاتی مفاد کی حفاظت کے لئے استعمال کرتا ہے۔ مگر ہمارے کتنے ادیبوں نے اسکے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ اور تو اور وہ ادیب بھی خاموش ہیں جو مسلم غیر مسلم عوامی کلچر اور نہ جانے کیا کیا مسلم کے قائل ہیں۔

اقبال کو لیجئے، آج اقبال کو رجعت پسندوں، جاگیرداروں کی حمایت میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ اسکے اشعار کی غلط تفسیریں کی جا رہی ہیں، اور اس کے نام پر حکمران طبقہ اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے۔

کتنے ادیبوں نے اسکے خلاف آواز اٹھائی۔

اسلامی نظام حکومت کے نام پر فسطائی نظام تیار کیا جا رہا ہے۔ اور جو ادارے ایسے نظام کے محرک ہیں انکو حکومت کی پشت پناہی حاصل ہے۔ انکو تبلیغ اور نشر و اشاعت کی پوری سہولتیں مہیا کی جا رہی ہیں۔

ریڈیو کو ملک و قوم کی تہذیبی نشو و نما کیلئے نہیں بلکہ حکمران طبقے کے مفاد خصوصی کی حفاظت کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے۔

پرانے اور دقیانوسی رسوم کو سرکاری حمایت حاصل ہو رہی ہے۔ سائنس سے زیادہ MYTH پر زور دیا جا رہا ہے۔

ایسے موقع پر یہ مطالعہ کافی پر لطف رہیگا کہ یورپ میں فسطائی نظام سے پہلے کیا کیا رجحانات ابھر رہے تھے۔ مگر مضمون کی طوالت مانع ہے۔ بہرحال آج ان رجحانات کا ہر ادیب کو مقابلہ کرنا ہوگا۔ ورنہ یہ بحران اور شدت اختیار کر جائیگا۔ اس لئے آج کے حالات میں یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارا ادیب نہ صرف ان حالات کا تجزیہ کرے، بلکہ وہ ان حالات کو بدلنے کیلئے ان طبقوں سے رشتہ جوڑے جو ایک نئے نظام کی تخلیق کیلئے کوشاں ہیں۔ اسلئے نہیں کہ یہ مزدوروں اور کسانوں کی لڑائی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ یہ ہماری اپنی لڑائی ہے۔ اگر آج یہاں پر سماجی اونچ نیچ ختم نہیں ہوتی تو اس کا نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ ہمارے فن کو بھی جلا نہ مل سکیگی۔ اگر فسطائیت یہاں پہ مسلط ہو گئی تو صرف ایک مخصوص سیاسی رجحان کے ادیبوں کو ہی جو سمجھ کر کے نہیں چھوڑ دیا جائیگا بلکہ پوری تہذیب اور ادب کا ہی گلہ گھونٹ دیا جائیگا۔

انتظار حسین

قیوما کی دُکان

صبح ہی صبح جب میں لحاف میں منہ لپیٹے پڑا ہوتا اور نیم غنودگی کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی تو یکایک بدھن کی "دودھ لو دودھ" کی دلاویز صدا دور کی کسی دوسری دنیا سے خواب میں لپٹی ہوئی آتی معلوم ہوتی۔ اُدھر اس نے آواز لگائی اور ادھر میری آپا نے مجھے جھنجھوڑا "اے اٹھتے ہے کہ نئیں۔ جا دودھ لے کے آ" اور میں کروٹ لینے نہیں پاتا تھا کہ پھر ایک ولہ ہوتا "ارے اٹھتا کہ نئیں، پڑھنا نہ لکھنا۔ شام سے سناتا ہے۔ دنیا کے بچوں کو دیکھو بارے بارے بجے رات تک پڑھتے ہیں اور پھر اندھیرے سے اٹھ کے کتاب پہ جٹ جاتے ہیں۔ اس کم بخت نے ہر طرح سے ڈوب ڈال رکھی ہے۔" اور میں قہر درویش برجان درویش اٹھتا اور گلاس لے کے دودھ لینے چلا جاتا۔ خیر صاحب دودھ لانا میرے ذمے تھا اور میں لا دیتا تھا لیکن بات یہاں آکر ختم تھوڑا ہی ہوتی تھی۔ میں نے دودھ کا گلاس آپا کے ہاتھ میں تھمایا۔ انہوں نے اسے غور سے دیکھا، ایک دو جھٹکے دئے اور پھر چلانا شروع کر دیا "اے لوٹے کی باتیں۔ یہ دودھ دیا ہے کم بخت نے۔ نرا پانی۔ جاؤ اسے اس کے منہ پہ مار آؤ۔ ایسے کوئی مفت کے پیسے آگئے ہیں ہمارے پاس۔" اور دودھ کو اس کے منہ پہ مار آنا ہی بس اپن کے بس کا نہیں تھا۔ بدھن ایسا کوئی گیا گزرا تو تھا نہیں۔ اسے تو کسی کی پروا بھی نہیں تھی کہ کون اس کا دودھ خریدتا ہے کون نہیں خریدتا۔ اس کے خریدار تو بہتیرے تھے۔ مجھے ذرا بھی دیر ہو جاتی تھی تو وہ ٹکا سا جواب پکڑا دیتا تھا "دودھ نئیں رے جی اب۔" اور پھر آخر ہمارے پاس اس بات کا ثبوت ہی کیا تھا کہ بدھن دودھ میں پانی ملاتا ہے۔ یہ تو دراصل نظریات کا فرق تھا۔ اسی دودھ کے لئے بدھن مکھن کی تشبیہ استعمال کرتا تھا۔ اور جب گھر لے کے پہنچتا تھا تو آپا اسے "نرا پانی" بتاتی تھیں۔ اس نظریاتی اختلاف سے قطع نظر بدھن اچھی قسم کا ایک ہی آدمی تھا۔ لمبا تڑنگا۔ کالا رنگ۔ گٹھا ہوا جسم۔ ہاتھ میں ہر وقت لاٹھی لگی رہتی تھی۔ دودھ دوہتے وقت بکری کی ٹانگ اس انداز سے دباتا تھا کہ مجال نہیں ذرا چوں چرا کر جائے۔ بنوٹ غضب کی جانتا تھا۔ دور دور کے گاؤں میں اس کی لٹھیا کی دھوم تھی۔ بڑے بڑوں کے اس نے سر توڑے تھے۔ اسی لئے اس کے دشمن بھی بہت ہو گئے تھے۔ کئی دفعہ تو جنگل میں اسے ڈاکوؤں نے گھیر بھی لیا تھا۔ لیکن بدھن بھلا مار کھانے والا تھا۔ اسے تو اپنی لٹھیا پہ بھروسا تھا۔ بیٹھا بے کھٹکے رات بیرات کو جہاں جی چاہے گھومتا تھا۔ رات کو قیوما کی دوکان پہ آ کے اس کی باتیں سنو۔ قیوما کی دوکان پہ رات کو بلا ناغہ دودھ پینے آیا کرتا تھا۔ مگر دودھ پینے کے معنی یہ تھوڑا ہی ہیں کہ آئے دودھ پیا کلھڑ پھوڑا پیسے پھینکے اور چلتے بنے۔ اور قیوما کی دوکان پہ دودھ پینے والے تو دودھ کو ثانوی حیثیت دیتے تھے۔ میں تو آپا کے ڈر کے مارے گیارہ بارہ بجے گھر چلا آتا تھا اور پھر بھی ڈانٹ پڑتی تھی۔ اللہ ہی جانے یہ بھیڑ رات کو کب تک جمی رہتی تھی۔ بدھن، حسینی گدی، رمضانی قصائی، الطاف پہلوان، مکرجی اور کہاں تک نام گناؤں یوں سمجھ لو کہ محلہ کے سارے چھٹے چھٹے آ کے بیٹھ جاتے تھے اور پھر وہ زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتے تھے کہ بس دیکھا ہی کرو۔ حسین گدی کی تو خیر الگ بات تھی۔ اس کا تو کام ہی ایسا تھا کہ وہ باقاعدگی سے نہیں

آسکتا تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی تو وہ مہینہ مہینہ دو دو مہینہ کو غائب ہوجاتا تھا۔ اور اگر کہیں پولیس کے ہتھے پڑ جاتا تو ساون کی خبر لاتا تھا۔ اس کی بات تو کچھ سندباد جہازی کی سی تھی۔ تھوڑے دن کے لئے گھر آیا۔ پیسہ کوڑی گھر میں رکھا۔ قیوما کی دوکان پہ مہر کے سنائے۔ اور پھر جہاد کی نیت سے روانہ ہوگیا۔ الطاف کا یہ تھا کہ وہ پہلوان آدمی تھا۔ بڑی باقاعدگی سے دودھ پینے آتا تھا۔ اور ویسے بھی استاد نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ "بے الطاف جورو کے پاس گیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا" سو اس کا بس چلتا تو وہ ساری رات قیوما کی دوکان پہ ہی گذار دیا کرتا۔ الطاف کی کاٹھی بڑی اچھی تھی تھوڑے سے دنوں میں اس نے تو وہ رنگ دکھایا کہ سارے میں ہوا بندھ گئی۔ اور جب ہوا کو اس نے پچھاڑ دیا تو ہر ایک کی زبان پہ الطاف ہی الطاف تھا۔ رمضانی قصائی کی بات ہی الگ تھی۔ اگر ایک طرف وہ حسینی کی ٹکر کا تھا تو دوسری طرف بدھن سے بھی کم نہ تھا۔ ہم میں اس کی ذات پہ بڑی بڑی بحثیں ہوتی ہیں۔ حبیب کی رائے یہ تھی کہ "رمضانی کا نام ہی نام ہے بدھن سے تو وہ ہیر کے ۔ ا یہ بھی نہیں ہے" لیکن منے کا کہنا یہ تھا کہ "بدھن تو کل کا چھوکرا ہے۔ لٹھیا کے جو ہاتھ رمضانی کو معلوم ہیں انکی تو بدھن کو ہوا بھی نہیں لگی ہے" اور منا اپنی بات۔ کے ثبوت میں بہت سے تاریخی شواہد بھی پیش کرتا تھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس سلسلہ میں منے کی رائے اعتدال پسندانہ ہونے کے باعث زیادہ وقیع تھی۔ جب حبیب اور منے میں بہت زیادہ گرما گرمی ہونے لگتی تو وہ کہتا کہ "دیکھو بھئی بات یہ ہے کہ بدھن تگڑا بہت ہے۔ جس کے اس کی لٹھیا پڑ جائے سالا اٹھ نہیں سکتا۔ مگر پھر وہ ابھی کل کا بچہ ہے۔ رمضانی بہت گھاگھ ہے۔ داؤں اسے بہت یاد ہیں" اور اس بات کا اثر وہی ہوتا جو مرزا باسط کے اس جملہ کا ہوا تھا کہ "ایک کا کلام آہ ہے اور ایک کا واہ ہے" یہ واقعہ بھی ہے۔ جس طرح ہم میر کو سودا پر اور سودا کو میر پر ترجیح نہیں دے سکتے۔ اسی طرح یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ رمضانی بدھن سے بڑھا ہوا تھا۔ یا بدھن رمضانی سے بڑھا ہوا تھا۔ رہی حسینی اور رمضانی کے مقابلہ کی بات تو بھئی حسینی کی عظمت اسی سے ثابت ہے کہ کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ جیل میں زیادہ رہا ہے یا گھر پہ زیادہ بیٹھا ہے۔ لیکن بہت سی باتوں میں رمضانی اس سے بڑھا ہوا تھا۔ جس طرح کوئی شخص حسینی کے قید میں رہنے کی مدت کا تعین نہیں کرسکتا تھا اسی طرح کوئی شخص رمضانی کی بیویوں کی تعداد بھی ٹھیک نہیں بتا سکتا۔ جب بھی وہ مہم سے واپس آتا تھا تو اور بہت سی چیزوں کے ساتھ ایک بیوی بھی لاتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس محنت کے باوجود کسی نے اسکے گھر میں کبھی دو سے زیادہ عورتیں بیک وقت نہیں دیکھیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ رمضانی، حسینی اور بدھن وغیرہ کا آپس میں موازنہ کرنا غلط ہے ان کی تو اپنی الگ الگ شخصیتیں تھیں۔ نہ وہ آپس میں کسی سے بڑے تھے نہ کسی سے چھوٹے تھے۔ خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان سب کا جمگھٹا قیوما کی دوکان پہ رہتا تھا۔ اور جس نے بھی قیوما کی دوکان دیکھی ہے وہ حسینی، رمضانی، بدھن، الطاف، اور کمرجی کو نہیں بھول سکتا۔ آپ 'کمرجی' کے لفظ پر لاکھ ناک بھوں چڑھائیں لیکن میں تو کمرجی ہی کہونگا۔ میں کوئی ماہر لسانیات تو ہوں نہیں کہ یہ تحقیق کرتا پھروں کہ کنورجی بگڑ کر کمرجی کیسے بن گیا۔ اور نہ مجھے زباندان بننے کا خبط ہے کہ زیر زبر درست کرکے کنورجی کہوں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ کمرجی کی پوری شخصیت کا اظہار 'کمرجی' میں ہی ہوتا ہے 'کنورجی' میں نہیں۔ کمرجی بھی واقعی کیا چیز تھے۔ انہیں غمگین تو کسی نے آج تک دیکھا ہی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مجلس میں رونے والوں میں ان کی آواز سب سے بلند ہوتی تھی۔ لیکن اس قسم کی عینی شہادت کوئی نہیں ملتی کہ انکے آنسو بھی واقعی نکلتے تھے۔ اور پھر غم حسین میں گریہ و زاری تو اپنا ایک الگ خانہ رکھتی ہے۔

اسے آپ عام قسم کے غم و حزن میں خلط ملط کیوں کریں۔ یہاں مجھے ایک بات اور یاد آگئی۔ کمر جی کے خسر کی ہلچل کربلے کئی تھی۔ اس موقعہ پر انہوں نے ایک بڑا پر سوز نوحہ لکھا تھا۔ اور اگر یہ نوحہ انیس کی بکری کے مرثیہ کی طرح مشہور نہیں ہو سکا تو اسے انکی بے نیازی سے تعبیر کیجئے یا بد قسمتی سے۔ کم از کم ان کی شعری صلاحیتوں پر اس وجہ کی بنا پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دورہ لگانے کا مرض کمر جی کو بھی تھا۔ لیکن وہ دو تین دن سے زیادہ کہیں نہیں ٹکتے تھے۔ ہر دورہ کے بعد وہ کسی نئے نواب نئے رئیس کا ذکر کرتے آتے تھے۔ اور جب وہ اپنی عقلمندی اور اس نواب کی قدردانی کا ذکر کرتے تو ان کی باتوں میں ایک دبی دبی حسرت جھلکتی کہ کاش وہ بھی کسی راجہ مہاراجہ کے مصاحب ہوتے۔ انہیں اس بات کا احساس کبھی نہ ہؤا کہ قیوما کی دوکان کے چبوترہ پر ان کی حیثیت خود ایک راجہ کی سی تھی۔ کمر جی کو دوسروں کو آپس میں لڑانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ بس ان کا کام تو یہ تھا کہ کوئی شوشہ چھوڑ دیا اور پھر لوگ آگ۔ آپس میں گتھ جاتے تھے اور کمر جی تماشہ دیکھتے رہتے تھے۔ اگر ان بحثوں کا کبھی کوئی بیّن نتیجہ نہیں نکلا تو یہ اک الگ بات ہے۔ الطاف اپنے خلوص اور عقیدتمندی کے باوجود کبھی یہ ثابت نہ کر سکا کہ اس کا استاد بنّے کلو خاں سے اچھا گانے والا ہے۔ یوں بحثیں تو بہت ہوئی ہیں اور حسینی نے اپنی صفائیاں بھی بہتیری پیش کی ہیں۔ لیکن یہ مسئلہ آج بھی اتنا ہی پر اسرار اور اتنا ہی الجھا ہؤا ہے کہ تو اتیلی والے کے پاس ا۔ تنے روز نے منڈوے اٹھانے کو پیسے کہاں سے آتے تھے۔ بات کبھی کبھی سیاست تک بھی پہنچ جاتی تھی۔ صدیق نائی اگرچہ "انجام" بلا ناغہ پڑھتا تھا اور میر صاحب کی بیٹھک میں حجامت کے دوران میں اس نے سید بھائی کی بصیرت افروز سیاسی بحثوں سے استفادہ بھی کیا تھا۔ پھر بھی وہ بدہن کو کبھی قایل نہ کر سکا۔ یوں صدیق اسے اپنی علمیت کے زور سے گھیرے میں لے آتا تھا۔ لیکن بدہن کا ایک آخری حربہ اتنا موثر تھا کہ صدیق چاروں خانے چت جاتا تھا۔ بدہن کہتا "بس جی۔ ہمیں تو تم ایک بات بتا دو۔ یہ تمہارے جناح صاحب ڈاڑھی کیوں نہیں رکھتے"۔ اور یہاں آکر صدیق واقعی بغلیں جھانکنے لگتا۔ لیکن رمضانی نے ایک روز اس بات کا بڑا منہ توڑ جواب دیا۔ کہنے لگا کہ "بھیا یہ جتنے تمہارے مولبی لوگ ڈاڑھی رکھے رکھے پھرے ہیں سب ڈاڑھی کی اوٹ میں شکار کھیلے ہیں"۔ بدہن کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ کہنے لگا "دیکھ بے رمضانی علماؤں کی شان میں بے ادبی ہوگی تو تو ہی جانے گا"۔

رمضانی بولا "ابے سچی بات کہہ دی تو تتئے لگ گئے"۔

"بیٹا تیرے لگ گئے یا میرے لگ گئے"۔ بدہن بولا "جواب نہیں بن پڑا تو علماؤں پہ آگیا۔ ابے یہ تمہارے جناح صاحب مسلمانوں کے لیڈر بنے ہیں۔ نماز یہ نہیں پڑھتے۔ روزہ یہ نہیں رکھتے۔ اور بھئی خدا کی قسم انگریز سے انہیں تنخواہ ملتی ہے"۔

"پیارے یہ بات تمہارے علماؤں میں ہے۔ ایک ایک علما کی کانگرس سے تنخواہ بندھی ہوئی ہے۔ مزے کرتے ہیں بیٹھے"۔

"دیکھ بے رمضانی۔ زبان سنبھال کے بول"۔ بدہن پھر بھنّایا۔

رمضانی کو بھی طیش آگیا "ابے ہے کس بھلانے میں۔ چیر کے دو کر دونگا سالے"۔

کمر جی نے جو دیکھا کہ بات بگڑتی ہی جا رہی ہے فوراً بیچ میں آگئے "ابے سالا سٹھ کیا کرتا ہے۔ کونسی

تو نے بہن بیاہ دی ہے مجھا پنی۔ اورا دسنے بدہن تجھ میں بڑی گرمی آرہی ہے۔ سالے بیاہ کیوں نہیں کرلیتا۔ اور کوئی نہیں تو ستو ہی سہی۔ اگر بینگی ہے تو کیا ہے۔ ویسے تو پھول کے ونیہ ہو رہی ہے۔"

اور پھر تو چاروں طرف سے وہ قہقہے پڑے کہ بدہن اور رمضانی دونوں کا اچھے خاصا احمق بھنس گیا۔ کرجی نے پھر اپنا رخ دوسری طرف پلٹا۔ "ابے او بے اختر والے۔ یہیں سوئے گا کیا۔ گھر نہیں جانا۔"

"ڈر لگے ہے کرجی۔" بندو نے کہا۔

اور متا فوراً بولا۔ "ابے بندو پیپل کے سامنے سے سنبھل کے نکلیو۔"

حسینی نے ڈانٹ بتائی۔ "کیوں ڈراتا ہے بے لونڈے کو۔ جا بندو بھیا چلا جا۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ تو سالا بکتا ہے۔"

"بیا ہے اس بھلائے مت رہنا۔ مار کھا جاؤ گے۔" الطاف بولا۔

"ہاں کھالی مار۔"

"اچھا جی۔ یاں بیٹا تمہارا چیتو کام نئیں آئے گا۔"

"الطاف بھیا چپکا بیٹھا رہ نا۔ کیوں بحث کرے ہے۔ صبح شام گئے ڈنر پیل آئے۔ قیوما کی دوکان پہ آکے گپیں مار لیں۔ تو نے دنیا دیکھی کاں ہے۔ ابے ہماری تو عمر ہی ان چکروں میں گذری ہے۔ وہ یاد تیں لے جب پرزر کے سال میرے پیچھے پولیس لگ گئی تھی تو ڈیڑھ مہینہ تک ایک ٹوٹی ہوئی قبر میں پڑا رہا تھا۔ حفیظا وخت بے وخت آکے کھانا دے جاتا تھا۔ چاروں طرف قبریں ہی قبریں تھیں۔ مگر یار کو تو کچھ نہیں ہوا۔"

الطاف بولا۔ "اجی یہ تو موقعہ ہے کہ کچھ نئیں ہوا۔ مگر اگر کچھ ہو جاتا تو ساری مردمی رکھی رہ جاتی۔"

"اچھا جی جیسے ہم نے کچھ دیکھا ہی نہیں ہے۔ بھئی قسم اللہ پاک کی ایسے ایسے جنگلوں میں گھوما ہوں جاں آدم ہوتا تھا نہ آدم ذات بیٹا تم ہوتے تو کلیجہ پھٹ جاتا۔ ایک دفعہ تو مہینہ بھر تک جھاڑیوں میں چھپا پڑا۔ سالا سارا جنگل سائیں سائیں کرتا تھا۔ اور واں اک تلیا جو تھی واں سے تو کلام مجید کی قسم رات بھر "چھپو چھپو" کی آواز آتی تھی۔ آخر جی ایک دن میں اٹھ کے چلا۔ تھا رات کے بارے بجے ہونگے۔ چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا۔ اماں کیا دیکھوں ہوں کہ ایک لمبا تڑنگا آدمی چلا آرہا ہے۔ میں نے سوچا، ہوگا کوئی سالا گنوار۔ چپکے نکل جاؤں۔ سوچ میں کھیت کے ڈول ڈول ہولیا۔ اماں تھوڑی دیر بعد کیا دیکھوں ہوں کہ وہ سالا پھر سامنے سے چلا آرہا ہے۔ اور آنکھ جو جھپکوں ہوں تو کھٹ سے میرے سامنے۔ کہنے لگا کہ پنجہ لڑا لے۔ ہم نے کہا کہ آجا سالے۔ بس ڈٹ گئے۔ نہ ہمارا پنجہ مڑے نہ اس کا۔ بھئی قسم اللہ پاک کی اس کا ہاتھ لوہا تھا لوہا۔ میں بھی سوچوں کہ یہ کون سا جودھا آگیا جو ہم سے ٹکر لیوے۔ جو اس کے پیروں کو جو میں نے دیکھا تو میری ہوا ہی تو کھسک گئی۔ اس کے تلوے آگے اور پنجے پیچھے۔ میں نے جناب قل پڑھنی شروع کر دی اور زور سے کٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں سالا خنخناتا ہوا بھاگا۔"

"کوری گپ۔" رمضانی نے فتویٰ لگا۔

"بھئی اللہ پاک کی قسم جو ذرا سا بھی جھوٹ ہو۔" حسینی نے حلفیہ انداز میں کہا۔

الطاف بولا:" اچھا تو تو پھٹے جمعرات کی شام کو اس پیپل کے نیچے سے نکل کے دکھا:"

"اور نکل گیا تو؟"

"پر جی شرط یہ ہے کہ سر میں چمبیلی کا تیل ڈال کے اور ہاتھ میں دودھ کا کٹورا لے کے نکلو۔"

"رئی۔ بول کیا کھلائے گا؟"

"افتی کے پیڑے"

"رئی ؟"

"رئی"

"مگر جی سن رئے او۔ گبوا رینا:"

"ہاں بے سن رہے ہیں۔ گواہ ہیں:"

مگر جی تیوما کی اسی دوکان پہ نہ معلوم کتنی شرطوں کی گواہ رہ چکی ہیں یہ اور بات ہے کہ ان میں سے شاید ہی کسی شرط کے پورا ہونے کا موقعہ آیا ہو۔ لیکن تیوما جیسا بے نیاز آدمی بھی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اسے کیا مطلب کچھ ہی ہو کر اسے تو اپنی دودھ کی کڑھائی اور کڑھائی کے نیچے جلتی ہوئی آگ سے مطلب تھا۔ دنگل کی باتیں ہوتی رہتیں اور جن پری کے قصے چلتے رہتے، اور کبڈی اور گلی ڈنڈے کے میچوں پہ تبصرے ہوتے رہتے۔ اور تیوما اسی ایک انداز میں آنکھیں جھپکاتے ہوئے دودھ چلاتا رہتا۔ اور پھر آگ پھونکتا اور پھر دودھ چلانے لگتا اور پھر کسی کو دودھ دینے لگتا۔ اور یکایک کوئی لونڈا آتا اور آتے ہی ساری دوکان سر پہ اٹھا لیتا" اے تیوما تیوما۔ جلدی دے نا۔ دو پیسے کی چا۔ اسے دیتا ہے یا نہیں" خواہش اسکی یہ ہوتی کہ جتنی دیر لگ جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ ایک ہاتھ سے وہ پیسے بجاتا اور دوسرے ہاتھ بڑی خاموشی سے نقلوں کی تھال کا جائزہ لینا شروع کر دیتا۔ تیوما نے آج تک کسی لونڈے کو نہیں ٹوکا، اگرچہ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ اپنی نیکی کی وجہ سے خاموش رہتا تھا یا مروت میں مارا جاتا تھا یا اسکی بھٹی سے نکلتا ہوا دھواں اسے کچھ نہیں دیکھنے دیتا تھا۔ میں تو تیوما کو نیک ہی کہونگا۔ اگرچہ میری یہ رائے میری آپا کی رائے کے بالکل متضاد ہے۔ میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ تیوما کے دودھ کی دبیز ملائی سنگھاڑے کی بینگ کی مرہون منت ہوتی تھی۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ اس کے پیڑوں میں ماوا کم اور شکر زیادہ ہوتی تھی مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ اس کے گھی میں مونگ پھلی کے تیل کا میل ہوتا تھا۔ یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ لیکن اس سے تیوما کی نیکی پر آخر کیا اثر پڑتا ہے۔ اور ایک بات یہ ہے کہ میری آپا کی تنقید تو ہر ایک کے متعلق ہی کچھ تخریبی رنگ لئے ہوئے ہوتی ہے۔ بدھن کا دودھ نرا پانی ہوتا تھا اور تیوما کے گھی بھی ملاؤ ہوتا تھا۔ اور رمضانی بھینس کا گوشت دیتا تھا۔ حالانکہ رمضانی تو میرا بہت ہی لحاظ کرتا تھا۔ جہاں میں پہنچا اور اس نے آواز لگائی "شیخ جی آج بڑا تگڑا جانور کیا ہے۔ کیا یاد کرو گے۔ بس جی میرے کہنے سے آج ہنڈیا میں گھی مت ڈلوئیو۔ میں گوشت لے کے خوش خوش گھر آتا آپا نے جہاں کھول کے دیکھا اور آسمان سر پہ اٹھا لیا: "اے ہئے موئے نے بھینسے کا گوشت دیدیا ہے۔ جا مار یادی کے سر سے" اور ایک آفت ہو تو گنتی جائے۔ اگر وہ بیچارہ ران کا گوشت دیتا تھا تو اعتراض یہ ہوتا کہ بالکل روکھا ہے۔ ذرا سی بھی تو چکناہٹ نہیں ہے۔ اگر دوسرے دن رد عمل کے طور پر سینہ کا گوشت دیتا تھا تو شکایت:"

ہوتی تھی کہ "اب نے ہٹنے نری ہڈیاں گڈیاں ہیں۔ بوٹی تو نام کو نہیں ہے۔" تو میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تو کچھ قنوطیت پرست واقع ہوئی ہیں۔ ہاں بھگت جی کے سودے کے متعلق انکی رائیں بالعموم رجائیت پسندانہ ہوتی ہیں۔ مگر بھگت جی کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ سارے محلہ میں ہی پاپولر تھے۔ بھگت جی کی دوکان کی دالیں بڑی چھانی پھٹکی ہوتیں، آٹا کھرے گیہوں کا، گھی میں ذرا جو ملاوٹ ہو۔ اور پھر اگرچہ وہ بنئے تھے مگر بالکل ٹھیک تولتے تھے۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ دن میں کتنی ہی مرتبہ تم سودا لینے جاؤ اور چاہے دھیلے کا ہی سودا لو لیکن بھگت جی اسی ایک سائز کی سنہری گڑ کی ڈلی ہر دفعہ ہاتھ پر رکھ دیتے تھے۔ پھر اس بات کو بھی نہ بھولنا چاہئے کہ انکی دوکان کا تختہ اتنا نیچا تھا کہ ہم اچک کر بیٹھ سکتے تھے۔ ورنہ بعض ناعاقبت اندیش دوکانداروں نے اتنی اونچی اونچی دوکانیں لے رکھی تھیں کہ اس کے بہتر تک بس ہماری گردن پہنچتی تھی۔ بھگت جی کی دوکان پر "تیج" بڑی باقاعدگی سے آتا تھا۔ اور وہ اسے خود ہی نہیں پڑھتے تھے بلکہ دوپہر کو آس پاس کے دوکانداروں کو جمع کر کے اس کی خبریں ہلکی ہلکی حاشیہ آرائی کے ساتھ پڑھ کے سناتے تھے۔ مختصر یہ کہ سیاسی، سماجی، معاشی، اخلاقی، جغرافیائی غرض ہر اعتبار سے بھگت جی کی دوکان بہت خوب تھی۔ لیکن پھر بھی وہ بات کہاں جو قیوا کی دوکان میں تھی۔ وہ دکان ان باتوں سے دوکان تھوڑا ہی بنتی ہے۔ قیوا کی ددکان کی تو کچھ بات ہی اور تھی۔ رہا خوش اخلاقی اور دیانتداری کا معاملہ تو بھگت جی سے بڑھکے بنا عطار تھے بلکہ کھانسی کی گولیاں اور پیٹ کے درد کا چورن تو وہ لوگوں کو بالکل مفت دیتے تھے۔ بیچارے بڑے نیک اور بقول شخصے بڑے پکے مومن تھے۔ اور پکے مومن ہونے کی وجہ سے ہی ان میں یہ عیب پیدا ہوگیا تھا کہ محرم کے دنوں میں انکی دوکان زیادہ تر بند پڑی رہتی تھی۔ بات یہ ہے کہ انہوں نے تو اپنا کچھ فرض سا سمجھ رکھا تھا کہ ہر مجلس میں شریک ہونگے۔ اور نہ صرف شریک ہونگے بلکہ روئیں گے بھی۔ ورنہ قاعدہ کی بات یہ ہے کہ کسی مجلس میں شریک ہوئے کسی میں نہ ہوئے۔ اور جس میں شریک ہوئے اس میں کیا ضرور ہے کہ روئیں گے بھی ضرور۔ وقت اور مصلحت بھی تو کوئی چیز ہے۔ ایک شیخ جی بھی تو تھے کہ چوپال کی مجلس کے سوا کبھی کہیں نہیں روتے۔ صوبیدار صاحب ویسے بڑے حیدری تھے۔ لیکن ان پہ رقت اپنے اماباڑے میں ہی بیٹھ کر طاری ہوتی تھی۔ اور کمر جی کی تو خیر قدریں ہی الگ تھیں۔ وہ رونے میں بھی ان کا ضروری لحاظ رکھتے تھے۔ مختصر یہ کہ مجلس میں شریک ہونے اور رونے کے معاملہ میں بنا عطار جتنے ناعاقبت اندیش تھے اتنا شاید دنیا میں اور کوئی نہیں۔ وہ تو یہ کہئے کہ محرم کے زمانہ میں خوش قسمتی سے بہت سوں کو مخصوص طور پر کھانسی، زکام اور بدہضمی قسم کی شکایات ہوجاتی ہیں۔ ورنہ ان کی دوکان دس دن تک بند پڑی رہا کرتی۔ اونچے والوں کے یہاں کی مجلس ختم کی اور لپک جھپک آئے اور دوکان کھولی۔ انکا انداز ہی بتا دیتا تھا کہ اس وقت دوکان اپنے فائدہ کیلئے نہیں بلکہ خلقِ خدا بالخصوص مومنوں کے فائدہ کھولی جارہی ہے کسی کو ذرا سا چورن دیا، کسی کو گولیاں دیں کسی نے آکے شکایت کی کہ "کیا بتاؤں جی نیاز کے ذرا سے چاول کھا لئے تھے۔ اسی وقت سے پیٹ میں گڑبڑ ہو رہی ہے۔" انہوں نے جلدی جلدی ایک دو باتیں پوچھیں اور کوئی چیز دے دی۔ کسی نے کہا کہ "جی رات سبیل کا شربت پی لیا تھا۔ ٹھنڈ سے زکام ہوگیا۔" اور انہوں نے جھٹ پٹ دے کے اسے بھی نبٹایا اور تھوڑی دیر میں دوکان کو تالا لگا یہ جا وہ جا۔

یہ بات تو ہم نے قیوا کی دوکان ہی میں دیکھی کہ کچھ ہوجائے اسکی دوکان بند نہیں ہوسکتی۔ آندھی آئے۔

مینہ آئے، مجلس ہو، میلاد ہو، شادی ہو، غمی ہو، کچھ ہو اس کی دکان کھلے اور پھر کھلے۔ اور کھلنے کا سوال ہی کیا تھا۔ اسکی دوکان بند ہوتی ہی کب تھی۔ میں رات کو بارہ بارہ اک اک بجے اسے یونہی کھلا چھوڑ گیا ہوں۔ اور جب صبح اٹھ کر منہ دھونے کے لئے مسجد سے گرم پانی لینے گیا ہوں تو اس کی دوکان کو کچھ اسی طرح کھلا پایا ہے۔ قیوما کی دوکان کے عین سامنے نگل محمد صاحب کا امامباڑہ تھا۔ یہاں محرم میں کھچڑا بٹتا تھا اور بارہ وفات کے زمانہ میں میلاد بہت ہوتے تھے۔ اور ایک میلاد تو خاص طور سے حافظ جی کی طرف سے ہوتا تھا۔ بدائیوں کے پیڑے بٹتے تھے۔ بلا کی خلقت ٹوٹتی تھی۔ اور جو کور کسر رہ جاتی تھی وہ 'یا نبی سلام علیک' کی آواز پوری کر دیتی تھی۔ اور اس سارے ڈرامہ میں ایک لمحہ وہ آتا تھا جب سارا ہنگامہ سمٹا ہوا امامباڑہ کے پھاٹک کے پیچھے لہریں لے رہا ہوتا تھا۔ اور سامنے کا چبوترا بالکل خالی ہوتا تھا۔ اور قیوما اسی طرح سٹروں ڈبتا ہوا دودھ چلا رہا ہوتا تھا یا آگ پھونک رہا ہوتا تھا۔ کیا مجال کہ وہ کبھی اٹھ کر اپنا حصہ لے آئے۔ اس کا حصہ تو وہیں آ جاتا تھا۔ قیوما کا یہ استقلال، یہ بے نیازی، یہ پابندی وقت تاریخ میں یادگار رہے گی۔ اور اس کی دوکان تو خود بہت بڑی تاریخ کو اپنے سینہ میں بند کئے ہوئے ہے۔ اگرچہ یہ بات اسے معلوم نہیں ہے۔ اسے یہ کبھی خبر نہ ہوئی کہ ہماری زندگی میں کونسا روحانی یا سیاسی انقلاب رونما ہونیوالا ہے۔ اور یہ کہ اس انقلاب کی روئیں اس کی دوکان کے پٹڑے سے کیسے پھوٹ رہی ہیں۔ لوگ باگ اچھے بُرے ہر طرح کے مقاصد لیکر اس پٹڑے پہ آکر بیٹھتے اور بیٹھے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض ایسے ہوتے تھے جن کے جسم پٹڑے پہ ہوتے تھے اور روحیں سامنے والی گلی میں ہوتی تھیں۔ قیوما ان کی روح و قلب کے طوفان سے بے نیاز ہمیشہ اپنے اسی ایک کام میں لگا رہتا تھا۔ اس نے اس پراسرار مسئلہ کو سمجھنے کی کبھی کوشش نہ کی کہ اس کی دوکان کے سامنے مخصوص طور پر کیوں چند نقاب اٹھتے ہیں اور چند نقاب گر پڑتے ہیں۔ اس نے اس گتھی کو بھی سلجھانے کا کبھی ارادہ نہ کیا کہ آخر تنوا تیلی اتنا دودھ اور مٹھائیاں جو اڑا جاتا ہے اس کے پیسے حسینی کیوں چکاتا ہے۔ اس نے یہ بھید بھی کبھی سمجھنا نہ چاہا کہ یہ بعض بعض لڑکے اس کی دودھ کی کڑھائی کی طرف پشت کر کے کیوں گھنٹوں ایک زاویے سے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور ان کی نگاہیں کیوں سامنے والی گلی کے ایک مخصوص جنگلے پر جمی رہتی ہیں۔ قیوما کی دوکان کھلی رہتی تھی اور لوگ اس سے فیض یاب ہوتے تھے۔

لیکن وقت بدلتے ہوئے بھی کیا دیر لگتی ہے۔ میں نے اپنی انہیں آنکھوں سے قیوما کی دوکان کو بند پڑے دیکھا ہے۔ اب کسی کو یقین تو کا ہیکو آنے لگا ہے۔ لیکن میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ قیوما کی دوکان میں واقعی تالا پڑ گیا حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ نہ تو قیوما کا دیوالہ نکلا تھا۔ نہ اسکے گھر میں کوئی موت ہوئی تھی۔ اور نہ وہ بیمار پڑا تھا۔ اور پھر کچھ ایسی بات ضرور تھی کہ اسکی دوکان بند پڑی تھی۔ یہ درست ہے کہ اس روز بھگت جی کی دوکان بھی بند تھی۔ اور فقیرا کے چوک میں آلھا اودل پڑھنے والی چوکڑی بھی نہیں جمی ہوتی تھی اور بنا عطار کی دوکان میں بھی تالا لگا ہوا تھا۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن عشرہ نہ تھا۔ اور رمضانی کی دوکان پہ بھی پردے لٹک رہے تھے۔ اگرچہ وہ کسی جہنم پہ گیا ہوا نہیں تھا۔ اور اس روز بدہن کی دودھ لو دودھ کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی۔ اور الطاف بھی زور کرنے کے لئے اکھاڑے نہیں گیا تھا۔ میں اپنے گھر کے کوٹھے پہ چڑھ گیا۔ چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا تھا۔ بھگت جی کی دوکان بھی بند تھی۔ بنا عطار کی دوکان بھی بند تھی۔ چندو نیواڑی اور فقیرا حلوائی اور نتھو سنار کی دوکانیں بھی بند تھیں

اور قیوما کی دوکان بھی بند تھی۔ میں نے پھر غور سے دیکھا۔ قیوما کی دوکان واقعی بند پڑی تھی۔ اور اس کے پٹڑے پہ ایک کٹاتیم غنودگی کے عالم میں لیٹا تھا۔ یہ بات میرے کیا کسی کے خواب و خیال میں نہیں آئی تھی کہ قیوما کی دوکان ایک روز بند پڑی ہوگی۔ لیکن قیوما کی دوکان واقعی بند پڑی تھی۔ یہ بات میں نے دیکھی تھی سب نے دیکھی تھی۔

تین دن تک بھگت جی اور بنا عطار اور چندو پنواڑی اور فقیرا حلوائی کی دوکانیں بند پڑی رہیں۔ اور قیوما کی دوکان بھی بند پڑی رہی اور ٹوٹی پھوٹی سڑکوں اور کچی گلیوں کا وہ مختصر سا جال بھی ویران پڑا رہا۔ جو بھگت جی کی دوکان کو بنا عطار کی دوکان سے اور بنا عطار کی دوکان کو چندو پنواڑی اور فقیرا حلوائی کی دوکانوں سے اور چندو پنواڑی اور فقیرا حلوائی کی دوکانوں کو قیوما کی دوکان سے ملاتا تھا۔ وہاں چلتے پھرتے اب یا تو کتے دکھائی پڑتے تھے۔ یا سپاہی۔ چھوٹی بزریا میں اور چوک میں مسجد کے پیچھے والی گلی میں خاک اڑ رہی تھی۔ اور بڑی حویلی کے سامنے والے چبوترہ کی چکنی چپڑی سطح پہ گرد کی موٹی تہیں ایسے جم گئی تھیں جیسے کسی پیالے کے ہونٹوں پہ پپڑیاں جم جاتی ہیں۔ چھوٹی بزریا اور چوک اور مسجد کے پیچھے والی گلی اور بڑی حویلی کے سامنے والا چبوترہ ہی ویران نہیں پڑا تھا۔ بلکہ ان کے اوپر والا آسمان بھی ویران تھا۔ ورنہ یہاں تو اتنی پتنگیں اڑتی تھیں کہ سارا آسمان ان سے ڈھکا ہوا دکھائی پڑتا تھا۔ اور چھتوں اور کوٹھوں پہ لڑکوں کا وہ ہجوم ہوتا تھا اور وہ غل مچتا تھا کہ ساری فضا گونجتی ہوئی معلوم پڑتی تھی۔ یہاں کا آسمان صاف تو شاید ہی کبھی دکھائی دیا ہو۔ پتنگیں نہیں اڑتی تھیں تو شمی کے اور حبیب کے اور ممی کے کبوتر اڑتے تھے سفید سفید معصوم کبوتر فضاؤں میں بلند ہوتے چلے جاتے تھے۔ اور چھوٹے ہوتے چلے جاتے تھے۔ اور یہاں تک کہ تارا بنجاتے تھے۔ اور آسمان میں چپکے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن آج شمی اور حبیب اور ممی کے کبوتر بھی نہیں اڑ رہے تھے۔ اور بنیاد کا چاند تارا بھی نہیں اڑ رہا تھا اور چھوٹے لال اور نہال کے پیچ بھی نہیں لڑ رہے تھے اور چوک میں گلی ڈنڈا بھی نہیں ہو رہا تھا اور چبوترہ پہ گولیاں بھی نہیں کھیلی جا رہی تھیں۔ چوک آج ننگا ننگا سا دکھائی پڑتا تھا۔ چوک بھی ننگا تھا اور مسجد کے پیچھے والی گلی بھی ننگی تھی اور چھتیں بھی ننگی تھیں اور آسمان بھی ننگا تھا اور قیوما کی دوکان کا پٹڑا بھی ننگا تھا اور ہم خود ہی جو ننگے ہوگئے تھے۔

خدا خدا کرکے کرفیو ٹوٹا، اور لوگ گھر سے ایسے بے تحاشا نکل رہے تھے جیسے ڈربے سے مرغیاں یا کابک سے کبوتر نکلتے ہیں۔ شام کو جب میں قیوما کی دوکان پہ گیا تو ——— اور اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس 'تو' کے آگے کیا کہوں۔ قیوما کی دوکان واقعی بند نہیں تھی۔ اسکے کنواڑ کھلے ہوئے تھے اور اگرچہ کڑھائی میں دودھ کم تھا۔ لیکن قیوما عین بین اسی انداز سے دودھ چلا رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ پیڑے باسی تھے۔ اور نُقلوں کا رنگ بھدا پڑ گیا تھا۔ ورنہ تھالیں تو اسی پرانے قرینے سے چنی رکھی تھیں۔ اور پھر بھی جب میں یہ سوچتا ہوں کہ ا کی دوکان کھلی ہوئی تھی تو میری آنکھوں میں ترمرے ناچنے لگتے ہیں۔ بدہن اور رمضانی اور حسینی اور الطاف اپنی پرانی ٹھیکوں پہ بیٹھے تھے لیکن آج انہیں چپ لگ گئی تھی۔ اور کمر جی کو تو گویا جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ چنو گھبرایا ہوا سا کھڑا تھا اور قیوما سے دو پیسے کی چاء مانگ رہا تھا۔ آج واقعی اس کا یہ ارادہ معلوم ہوتا تھا کہ چائے کی پڑیا لے کے جلدی سے گھر چلا جائے۔ اس کے ایک ہاتھ میں پیسے بج رہے تھے اور دوسرا ہاتھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خشک ہوگیا ہے اور نُقلوں کی تھال پہ مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ بدہن نے حقہ بھی بھر کے رکھ دیا تھا اور وہ اونچے نیچے بالوں والی

بنج بھی حسب معمول بچھا دی تھی اور پھر بھی تکنے کا کوئی نام نہ لیتا تھا۔ لوگ جلدی جلدی سودا سنبھالتے تھے اور پیسے پھینکتے تھے اور گلیوں میں سٹک جاتے تھے اور پھر کیواڑوں کے دھاڑ دھاڑ بند ہونے کی آوازیں آتی تھیں۔

رمضانی آپ ہی آپ کہنے لگا: "مگر جی کسیز والوں نے بھی کر دیا کمال۔"

"اور نہیں تو اتنک تو یاں ہلہ بھی بول دیا جاتا" الطاف نے جواب دیا۔

"بھئی ایمان کی بات یہ ہے کہ کسیز والے ہیں جیدار۔"

بدہن تنک کے بولا "اور جی ہم تو بالکل ہیچ ہیں۔ پیارے ایک دفعہ ہو جانے دے سالوں کے تو س ہنیر بکھیر دئے تو بات نہیں"

رمضانی نے جواب نہ دیا۔ اور الطاف اور حسینی اور کمرجی بھی چپکے رہے۔ اور قیوما بھٹ کی بجھی ہوئی آگ برابر پھونکتا رہا۔

بدہن پھر بڑبڑانے لگا: "آمنے سامنے کی نہیں ہوتی۔ ہم بھی تو دیکھیں کونسا مائی کا لال ہے جو ٹکتا ہے۔ کیوں بے حسینی بولتا کیوں نہیں ابے بے؟"

"ہوں ہاں" حسینی پھر چپکا ہو گیا۔ اور الطاف اور حسینی اور کمرجی گم صم بت بنے بیٹھے رہے۔ اور قیوما بدستور آگ پھونکنے میں مصروف رہا۔

"اس سالے کی تو میا مری جا رہی ہے۔ ابے ناک چھدا کے جورو کے پاس بیٹھ رہا" پھر بدہن چپکا ہو گیا۔ اس کے چہرہ کا سناٹا دبیما پڑتا چلا گیا۔ اس کا جسم کچھ سکڑنے لگا۔ اور اس کی نگاہیں ٹھنڈے دودھ پر جم گئیں۔ چہرہ بے حرکت بن گیا۔ اور اس کی نگاہیں ٹھنڈے دودھ پر جمی کی جمی رہ گئیں۔ بدہن بت بن گیا تھا۔ رمضانی اور الطاف اور کمرجی بھی بت بن گئے تھے۔ اور قیوما بدستور بجھی ہوئی آگ پھونکے جا رہا تھا۔ قیوما بدستور بجھی ہوئی آگ پھونکے چلا جا رہا تھا اور چولہے سے دھواں برابر اٹھے چلا جا رہا تھا۔ چولھے سے دھواں اٹھ رہا تھا اور بدہن اور رمضانی اور حسینی اور الطاف اور کمرجی کے چہرے دھندلے دکھائی پڑ رہے تھے۔ اور ریوڑیوں اور پیڑوں کی تھالوں پہ بھی دھند چھا گیا تھا۔ اور گل محمد کا اماباڑہ بھی دھندلا دھندلا نظر آتا تھا۔ اور سامنے والی گلی کا وہ دریچہ بھی ملگجا سا معلوم دے رہا تھا۔ اور مسجد کے سیاہی آلود سفید مینار بھی دھند میں اٹے دکھائی پڑتے تھے۔ پھر کمرجی ایکا ایکی چونک پڑے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کہیں چپکے سے کھسک گئے تھے اور اچانک ہمارے درمیان پھر آ گئے ہیں۔ کہنے لگے کہ "ابے قیوما آج دودھ تو تو نے پلا چکا۔ ابے کہاں سے یہ ایندھن اٹھا لایا ہے۔ سالا سارا دھنواں ہی دھنواں کر دیا۔" اور پھر کمرجی چپکے ہو گئے گویا ان کے جملے اپنا جواب آپ ہیں۔ قیوما جواب ہیں اور زور زور سے آگ پھونکنے لگا۔ لیکن آگ شاید کہہ رہی تھی کہ اب میں نہیں جلونگی۔ کبھی نہیں جلونگی۔

بدہن اور حسینی اور رمضانی اور الطاف کو کیا ہو گیا تھا اور کمرجی کی زبان کو کیوں تالا لگ گیا تھا۔ یہاں کب کب معرکے نہیں پڑے تھے۔ بدہن اور حسینی اور رمضانی نے یہ معرکے مارے تھے اور میں نے یہ معرکے کچھ دیکھے تھے کچھ سنے تھے۔ اور میں نے تو انہیں بڑی بری بری حالتوں میں بھی دیکھا ہے۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب بدہن کا سارا کرتا خون سے شرابور ہو رہا تھا۔ اس کی کھوپڑی سے خون کا فوارہ

جھوٹ رہا تھا اور پھر اسکی آنکھوں میں بھی خون اتر رہا تھا۔ میں وہ دن بھی نہیں بھولا ہوں جب میں صبح ہی صبح گوشت خریدنے گیا تھا اور دیکھتا کیا ہوں کہ رمضانی کی دوکان باسی پڑی ہے اور ایک کتا سوکھی ہوئی ہڈی کو دانتوں سے توڑ رہا ہے۔ میں اسی کشمکش میں تھا کہ رمضانی ایکا ایکی کہاں اڑ گیا ہے۔ اتنے میں منے میرے پاس دوڑا ہوا آیا اور بدحواسی کے عالم میں بولا "ابے رمضانی کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا تھا۔ شفاخانے میں پڑا ہے۔" اور پھر ہم دونوں شفاخانے کو اٹھے چلے گئے۔ رمضانی کی بری حالت تھی۔ اس کا سارا بدن لہولہان ہو رہا تھا۔ اسکے ہاتھ کی ہڈی پہ بہت ضربیں پڑی تھیں۔ وہ مارے درد کے کراہ رہا تھا۔ لیکن اسکی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ اور اتنے میں ڈاکٹر جوشی اور اسکے پیچھے وہ گول مٹول کمپونڈر مرہم پٹی کا سامان لیکے چلا آیا اور ہم باہر کھسک آئے۔ باہر نیم کے نیچے لونڈے کھڑے تھے اور بڑی سنجیدگی سے اس حادثۂ فاجعہ پر بحث ہو رہی تھی۔ نجی کا کہنا تھا کہ کھیت کے بیچ میں سے نکل رہا تھا۔ ایک کسان نے اسے ٹوک دیا تھا۔ رمضانی نے اسے گالی دیدی۔ اور اس بات پہ سارے گاؤں والے اس پر ٹوٹ پڑے۔ جیبے کا قیاس یہ تھا کہ گنگا کے میلہ پہ گدیوں کی ایک ٹولی سے لڑائی جو ہو گئی تھی اور جسکی رمضانی نے خوب ٹھکائی کی تھی۔ یہ انہوں نے اپنا بدلہ لیا ہے۔ مگر منے کو یقین تھا کہ ہو نہ ہو یہ اُن ڈاکوؤں کی کارستانی ہے جن سے رمضانی کی پارٹی کی ایکدفعہ جنگل میں ٹکر ہو گئی تھی۔ اور جن سے سارا روپیہ پیسہ اور زیور رمضانی نے دھروا لئے تھے۔ لیکن اس بات پہ سب متفق تھے کہ یہ حملہ رمضانی پر محض اس وجہ سے ٹوٹا ہے کہ اسکے پاس اسوقت لاٹھی نہیں تھی۔ اور جب منے نے یہ کہا کہ "رمضانی کہیں اچھا ہو گیا تو ایک ایک کے بکل اڑا دیگا۔" تو یہ بھی گویا اس نے سب کے دلی جذبات کی ترجمانی کی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ زخمی رمضانی کی آنکھیں یہی کہہ رہی تھیں۔ لیکن رمضانی آج اچھا بھلا تھا اور پھر بھی اسکی آنکھوں میں مردنی تیر رہی تھی۔ اور بدھن کے سر سے خون کا فوارہ نہیں چھوٹ رہا تھا لیکن پھر بھی اس کا جی چھوٹا جا رہا تھا۔ اور حسینی کے پیچھے پولیس لگی ہوئی نہیں تھی مگر پھر بھی اسکے چہرہ کا رنگ اڑا سا گیا تھا۔ میرا تو یہ ایمان تھا کہ رمضانی، بدھن، حسینی اور الطاف کسی سے نہیں ہار سکتے۔ کسی سے نہیں ڈر سکتے۔ لیکن آج یہ ان چار بڑوں کو کیا ہوا جا رہا تھا۔

اتنے میں نمبردار نہ معلوم کدھر سے نکل آئے اور بدھن کو دیکھتے ہی برس پڑے "ابے یہاں بیٹھا باتیں بنا رہا ہے۔ تیری ڈیوٹی ہے آج ...... اور دیکھنا ادھر آنا۔" پھر بدھن اور وہ بڑے برہم انداز میں باتیں کرتے ہوئے گلی میں مڑ گئے۔ پھر تھوڑی دیر میں شاید نو بج گئے تھے اور سپاہیوں نے لوگوں کو ڈنڈا پھٹکارنا شروع کر دیا۔ قیوما اپنی دوکان بند کرنے لگا اور ہم سب اپنے اپنے گھروں کو چلے۔ میں نے قیوما کی دوکان اپنی آنکھوں سے بند ہوتی ہوئی دیکھی۔

پھر میں پاکستان چلا آیا۔ یہاں آکر مجھے نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ ایک یبوست سی ذہن پہ طاری رہتی ہے۔ مجھے گھن لگ گیا ہے۔ میں گھلتا چلا جا رہا ہوں۔ ایک روز انارکلی بازار میں نمبردار سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ بیچارے بہت روتے تھے۔ انکی بہت بڑی جائداد تھی، بڑا زیور اور روپیہ تھا۔ سب کچھ چھوڑ آئے۔ میرے جی میں آئی کہ ان سے قیوما کی دوکان کے متعلق کچھ پوچھوں مگر وہ تو اپنی باتوں میں ایسے الجھے ہوئے تھے کہ پھر میری ہمت نہیں پڑی۔ یہ انارکلی کا بازار بھی خوب ہے۔ بچھڑے ہوئے پناہ گزین یہاں ایکدوسرے سے ملتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی لاہور میں ہو اور اس سے کبھی نہ کبھی انارکلی میں ٹکر نہ ہو جائے۔ قیوما بھی ایکدن مجھے اسی بازار میں ملگیا تھا۔ اس بازار میں جہاں عالیشان دوکانوں کی قطاریں دور تک چلی گئی ہیں قیوما کتنا عجیب معلوم ہو رہا تھا۔ اسنے مجھے بتایا کہ اسکی دوکان رام نگر میں ہے۔ ایک روز میں چلا چلا رام نگر بھی پہنچ گیا۔ پہلے تو میں کچھ سٹ پٹا سا گیا مجھے خیال ہوا کہ کسی اور کی تو یہ دوکان نہیں ہے لیکن تختے پہ قیوما بیٹھا تھا۔ ایکطرف بڑے قرینہ سے شیشہ کی الماری رکھی تھی۔ کچھ پیالیاں بہت سلیقہ سے چنی ہوئی تھیں۔ بجلی کی روشنی سے ساری دوکان جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ اسکے بعد پھر میں اسطرف کبھی نہیں گیا۔ میں اب بھی کبھی کبھی یہ سوچنے لگتا ہوں کہ آخر قیوما نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔ اور میرے سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ بس کچھ ترمرے سے میری آنکھوں میں ناچنے لگتے ہیں۔

عبدالمتین عارف

ماں

مرے سپوتو!
مرے عزیزو!!
میں ایک مدّت سے اجنبی حکمراں کے زنداں کی سختیاں خود پہ سہہ رہی تھی،
سفید فام اجنبی ستمگر،
مجھے غلامی کی آہنی بیڑیوں سے بے دست وپا بنا کر،
میرے بدن کی جوان رعنائیوں کا رس یوں نچوڑتے تھے،
کہ جس طرح برگِ گُل سے عطرِ نشاط پرور کشید کرلیں،
میرے حسین وگداز پیکر کو روز و شب یوں جھنجھوڑتے تھے،
تمہاری ماں جیسے اک طوائف ہو، ایک مطعون بیسوا ہو!

تمہاری غیرت، تمہاری جہدِ طویل نے آج مجھ کو اس شرمناک اندازِ زندگی سے رہائی بخشی
اور آج انہیں کے طفیل میں ایک غیر پابند عالمِ رنگ و نو میں سانس لے رہی ہوں،
مگر صد افسوس آج ہی تم اُلجھ گئے ایک دوسرے سے،
اور ایسے اُلجھے کہ اپنی اس پا بُریدہ ماں کو بھی روند ڈالا،
تمہاری تیغوں نے میرے سینے کے گھاؤ دو چند کر دیئے ہیں،
مرے عزیزو!
مرے سپوتو!!
ذرا جبینوں سے خُون پونچھو،
مجھے سنبھالو ـــــ میں ورنہ جانبر نہ ہو سکوں گی!

افضل پرویز

دیپک راگ

جھپ تال بلمپت لَے سنپورن دیپک راگ   استھائی۔ ابھوگ۔ بڑھت۔ انترہ اور سنچاری
تانیں سارنگی کی اور تھاپ پکھاوج پر   دیپک پہ سنہری جلا سازندوں کی فن کاری

سُر لَے کی ترتیب اور سرگم کی بندش خوب   پر بجھے ہوئے دیپک میں اُستاد جی! آگ کہاں
اُس نغمے کے اجزا اُس دیپک کی کرنیں   جو میں سُن آیا ہوں وُہ دیپک راگ کہاں

کنواریاں پَو پھٹتے مٹی کے گھڑے اُٹھائے   اٹھلاتی ہوئی نکلیں گاؤں کے دھندلکے سے
ٹیڑھی پگڈنڈیوں پر بل کھاتی ہوئی اُبھریں   پیکاں برساتی ہوئیں متوالی پلکوں سے

گاؤں سے نکلتے ہی کھیتوں میں پہنچتے ہی   ماہیا کے سجل گیتوں کا کورس گانے لگیں
امرت ٹپکانے لگیں شعلے برسانے لگیں   ماحول لرزنے لگا ماحول پہ چھانے لگیں

اُس نغمے کے اجزا اُس دیپک کی کرنیں   اُن قہقہوں کی گمکیں، اُن باتوں کی سرگم
پرّاں آنچل کی لَے پازیبوں کی جھنکار   چنگاریاں اور شعلے آواز کا زیر و بم

ماحول سے چھنتی ہوئی انترے کی اٹھان بڑھی   گاؤں کو گھیرے ہوئے ٹیلوں کے ہالے تک
اور مدھم ہوتی ہوئی استھائی لطیف و سبک   قلقل جاموں کی کھنک، رنگیں کلیوں کی چٹک

کھیتوں سے نکلتے ہی اور موڑ سے مڑتے ہی   ٹھٹکیں۔ تانیں ٹوٹیں۔ اُڑتے آنچل سمٹے
لانبی پلکیں جھپکیں۔ گاؤں کی شفق بھڑکی   آپس کے ٹھوکوں پر کمریں لچکاتے ہوئے

سرگوشیاں کرتے ہوئے۔ مبہوت مسافر پر اک ایک نے قاتل۔ فنکارانہ نظر داغی
دیپک سے چمکنے لگے شعلے سے لپکنے لگے کھیتوں میں پہنچتے ہی اور موڑ سے مڑتے ہی
پھر آنچل اڑنے لگے پھر نغمے گونج اُٹھے پھر شعلے لپکنے لگے ماحول لرزنے لگا
گاؤں کو گھیرے ہوئے ٹیلوں کے ہالے تک اُف دیپک کی کرنیں اُف نغمے کے اجزا
اُس آگ میں جلتا ہے اک پردیسی اب تک اُس دیس کی پریوں نے وُہ دیپک گایا ہے
اُستاد جی! وہ ماہیا ہے وقت کی مانڈ سہی اُس مانڈ نے ہی لیکن من دیپ جلایا ہے
اس آپ کے دیپک کو تنویر کی حاجت ہے اس گاؤں کے ماہیا سے کچھ آگ چرالائیں
پراں آنچل کی نَے اُن قہقہوں کی گمکیں ممکن ہو تو گاؤں کا ماحول بھی لے آئیں

سید جابر علی

غزل

اسی پردے میں کوئی زمزمہ پرداز نہ ہو نغمۂ ساز میں پنہاں مری آواز نہ ہو
کچھ بڑی بات نہیں ضبطِ تمنا لیکن نگہہِ ناز کہیں پردہ درِ راز نہ ہو
ضبطِ غم کا یہ بہانہ بھی نہ راس آئے گا مسکراہٹ ہی کہیں درد کی غمّاز نہ ہو
لطفِ آغاز نہیں، کاوشِ انجام نہیں یہ اسی چشمِ فسوں ساز کا اعجاز نہ ہو

فکرِ انجام نہیں باعثِ بیتابئ دل
خوف اتنا ہے کہ دامن کشِ آغاز نہ ہو

محمد صدیق کلیم

پنڈت رتن ناتھ سرشار بحیثیت مزاح نگار

اردو ادب میں مزاح نگاری شعرا کے ہاں سے شروع ہوتی ہے۔ امیر خسرو اور سودا کے علاوہ پنڈت رتن ناتھ سرشار سے پہلے مزاحیہ تحریروں کا بیشتر حصہ ابتذال پر مبنی ہے۔ انشا۔ جرأت۔ رنگین اور جان وغیرہ یعنی ریختی کے لکھنے والوں نے فحش اور رکیک باتوں سے ہماری مزاحیہ حس کی تسکین کرنا چاہی ہے۔ ان لوگوں نے اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے درباری مسخروں کا سا مذاق روا رکھا ہے۔ جیسے کہ میر جعفر زٹلی اور چرکیں کی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کو سن کر کانوں پر ہاتھ رکھنا پڑتے ہیں۔

صحیح طور پر اردو میں ظرافت نگاری ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ کی اشاعت سے شروع ہوتی ہے۔ اس اخبار میں لکھنے والے آزادی کے ساتھ مختلف موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے جن میں اکثر و بیشتر ظرافت اور مزاح کی چاشنی ملی ہوتی تھی۔ اگرچہ خلافِ تہذیب تحریریں یہاں بھی ملتی تھیں۔ مزاح نگاری کے اس سکول میں منشی سجاد حسین اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کے نام قابل ذکر ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ پنڈت صاحب اپنی خوبیوں کی بنا پر ان سب سے ممتاز ہیں۔

ناول نویسی۔ قصہ گوئی۔ کردار نگاری اور مزاحیہ رنگ میں غالباً وہ اپنے وقت کے لکھنے والوں میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں اُن کا شاہکار فسانہ آزاد جب اودھ پنچ میں چھپتا تھا تو لوگ دوسرے پرچے کے لئے بے تاب رہتے تھے۔ اگرچہ پلاٹ بے ربط ہے۔ لیکن طرز تحریر اتنی شگفتہ اور دلپذیر ہے کہ جگہ جگہ آدمی ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور یہی جی چاہتا ہے۔ کہ ظرافت کے ان طویل چٹخاروں کو ختم کر کے ہی کوئی اور کام کیا جائے۔

سرشار کے ہاں مزاح زندگی کی طرح وسیع اور مختلف النوع ہے۔ اس وقت کی سماج کے ہر پہلو اور ہر قسم کے کردار کے مطابق انہوں نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ امرا کے طبقے میں شاہزادے اور شاہزادیوں کے تشبیہ و استعارہ اور گیت میں محبت اور عشق کے اظہار کے ساتھ ساتھ ظرافت کے نرم نرم حجلے۔ وکیل۔ آغا۔ خادم، مولوی، استاد اور پھر طلبا کا علمی اور سوشل قسم کا مزاح جس میں ذاتی پہلو بھی آجاتا ہے۔ اور لوگ طنز اور ہجو پہ بھی اُتر آتے ہیں۔ دوسری طرف میاں آزاد کا مزاح سلجھا ہوا شگفتہ۔ جسے آپ تبسم زیر لب کہہ سکتے ہیں۔ اور پھر نقلی آزاد کے کیریکٹر کا تصور ہی ظرافت کی کان ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور چور بھی۔ عاشق بھی اور سنگدل قاتل بھی۔ پھر نچلے درجے کے لوگوں کا بھونڈا عامیانہ اور رکیک قسم کا مذاق بھی عام ہے خوجی کا کیریکٹر خوب ہے۔ اس کے ساتھ اعلیٰ و ادنیٰ سبھی قسم کا مذاق وابستہ ہے کہیں کہیں فحش مزاح بھی ہے۔ لیکن اکثر قابل برداشت ہے۔

یہاں پر موزوں نہ ہوگا۔ اگر میں مزاح کی تعریف اور فلسفیانہ تشریح کرنا شروع کر دوں۔ مزاح زندگی کی طرح خوبصورتی کی طرح۔ محبت کی طرح اپنے معنوں میں بہت وسیع کی ہے۔ اس کی کئی تعریفیں ہیں اور کئی نظریے۔ اس لئے بہتر ہے

کو ہنسے جیتے جاگتے کرداروں میں ہی دیکھا جائے۔ مزاح اپنے آپ کو کئی طرح سے ظاہر کرتا ہے۔ ایک مزاحیہ نگار انسانی شکل۔ چہرے اور حرکات و سکنات دکھا کر آپ کو لوٹ پوٹ کر سکتا ہے تو دوسرا مزاحیہ صورتِ حالات سے آپ کو دنیا جہان کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے کچھ وقت کے لئے نجات دلا دیتا ہے۔ یا محض زبان اور تحریر ہی خود مزاحیہ رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ مگر ان سب سے بڑھ کر پر اثر اور دلچسپ چیز ایک مزاحیہ کردار کی تخلیق ہے۔ سرشار کے فسانۂ آزاد میں یہ سب باتیں پائی جاتی ہیں۔

شکل و صورت اور حرکات و سکنات کی ادائیگی میں سرشار نے ہمیں مزاح کی بہت خوبصورت مثالیں پیش کی ہیں۔ مثلاً — ہرمزجی اور خوجی میں پہلے سے مشورہ ہو چکا تھا کہ برات میں باجے کے عوض تالیاں بجیں اور خچر پر برات کا نشان ہو اور طالب علم بھی ساتھ ہوں۔ پانچ سات طلبا جن کو فارسی اردو کے اشعار کئی دن سے رٹا رکھے تھے اور دس بارہ نوکر اغل بغل چلے جاتے تھے۔ بیچ میں خوجی ٹٹو پر سوار۔ اکڑے ہوئے بیٹھے ہیں۔ چولی قرولی سنبھالتے۔ گیروے رنگ کی پوشاک سیاہ پگڑی۔ اوپر پھولوں کا سہرا۔ افیون کی ڈبیا کمر میں بار بار ٹٹولتے جاتے تھے۔ ٹٹو کی دم اور پیشانی سُرخ اور تمام بدن پر نیلے نیلے رنگ کے گول گول داغ۔ خاصے ہولی کے سوانگ تھے۔ رات تھی چاندنی۔ خوجی کی صورت دیکھ دیکھ کر لڑکے بے اختیار ہنستے تھے۔ جدھر سواری جاتی تھی۔ اس طوفانِ بے تمیزی کو دیکھ کر لوگ قہقہے لگاتے تھے۔

یا سپہر آرا کی ان حرکات پر دبی دبی مسکراہٹ لبوں پہ آتی ہے اور میرے خیال میں تبسم زیرِ لب کی بہترین مثال ہے

"سپہر آرا، مہتابی پر ہمایوں فر کی چاہ میں گئیں۔ لگی بڑی ہوتی ہے۔ کنکھیوں سے چپکے چپکے شہزادے پر نظر ڈالی۔ اُس وقت مرزا ہمایوں فر دوشالہ اوڑھے ہوئے کمرے میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ سپہر آرا نے آہستہ سے کنکری پھینکی۔ شہزادے نے جو گردن پھیری تو سپہر آرا کا چاند سا مکھڑا نظر آیا مگر سپہر آرا چھب دکھا کر فوراً ہٹ گئی۔

ہمایوں فر۔ واہ۔ بھلا ایسی ستم ظریفی سے کیا ملتا ہے۔ خدا کے لئے ایک نظر دکھلو۔

سپہر آرا آڑ میں کھڑی تھی۔ صورت تو نہیں دکھائی۔ مگر دوپٹے کے آنچل کو ہوا کے رُخ چھوڑ دیا۔

ایک خدمتگار نے جو اُن کی تقریر سُنی تو اوپر آیا۔ دیکھا اکیلے کھڑے ہوئے ہیں۔ گھبرایا یہ کیا ماجرا ہے۔ ڈرتے ڈرتے یوں کہا۔

خدمتگار۔ حضور کس سے باتیں کرتے تھے

ہمایوں فر۔ دیوار و در سے

عشق کرتے ہوئے ان نوجوانوں کی حرکات و سکنات کو دیکھنے والا ایک خاص حظ اٹھا کر پہروں مسکراتا رہتا ہے۔

مزاحیہ صورتِ حالات میں رتن ناتھ سرشار کی طرزِ تحریر بہترین ہوتی ہے۔ اس طرح مزاح میں انہوں نے اپنے زمانے کی تصویر کھینچ دی ہے۔ بیگمات کی زندگی۔ نوجوان شہزادوں کے اشغال۔ تماشے۔ شادی بیاہ۔ علمی ادبی سطح بحث مباحثے۔ پرانے رسم و رواج۔ غرضیکہ زندگی کا کون سا پہلو ہے جس کی انہوں نے عکاسی نہیں کی۔ حالانکہ قصہ محض میاں آزاد اور حسن آرا کی محبت سے متعلق ہے جس محبت کے طفیل میاں صاحب کو یہ خاک چھاننا پڑتی ہے۔

اب دیکھئے ایک آقا اور نوکر میں کشمکش ہو رہی ہے

آقا۔ بغیر خدمتگار کے جانا ہماری وضع کے خلاف ہے۔

نوکر۔ خدمتگار آپ کا کون ہے۔ ہم تو اس وقت مالک معلوم ہوتے ہیں۔ ہم آقا۔ تم نوکر۔ آگے آگے ہم۔ پیچھے پیچھے تم۔ آگے آگے راجہ۔ پیچھے پیچھے پرجا۔

آقا۔ ہاں! تو ہم کو آگے جانے دو۔ تم بڑے شریر ہو۔

نوکر۔ ہزار دفعہ کہہ دیا کہ میاں وحشت کی نہ لیا کرو مگر مانتے ہی نہیں۔ ابھی کوئی ایک ڈگ جاتے تو ساری مشیخت رکھی رہے۔ آئے وہاں سے رئیس بن کے۔

اور ذرا عورتوں کی کشمکش بھی ملاحظہ فرمائیے۔ سرکس کا تماشا ہو رہا ہے۔ بیگم صاحبہ مہریوں اور ہمجولیوں کے ساتھ تشریف فرما ہیں کہ ایک عورت سے ان کی مغلانی اور عباسی کی جھڑپ ہو جاتی ہے۔

عورت۔ مگر کوئی ان تماشے والوں کو برا بھلا بھی نہیں کہتی۔

بیگم۔ اچھا تو بیوی اب جانے دو

مغلانی۔ آخرش معلوم تو ہو کہ یہ تمہارے کون ہیں۔

عباسی۔ (چمک کر) اے حضور آپ کس کے منہ لگتی ہیں

بیگم۔ چلو تو چپ رہو۔

عورت (انگلیاں مٹکا کر) بس بس ذری زبان کو لگام دو۔

عباسی۔ صاحب۔ صاحب۔ اس موئی پوپلی چران کو یہاں سے نکال دو۔ اور سنئے کیا بڑھ بڑھ کے باتیں بناتی ہے۔ جانو میں بڑی وہ ہیں۔ کوئی پوچھے تم ہو کس میں۔

مغلانی۔ خان ہیں نہ خان کے اونٹوں میں۔

عورت (بیگم سے) یہ کن چہتیریوں کو ساتھ لائی ہیں آپ۔

زبان کے چٹخارے۔ محاوروں کی ظرافت اور فقروں میں از خود مزاح کی مثالیں بھی کچھ کم نہیں ہیں

"حضور خدا جانے کیا گٹ پٹ کرتا ہے

اوئی اللہ میں اپنی آنکھوں کو کیا کروں"

ان جملوں کے سنتے ہی آدمی خواہ مخواہ ہنس پڑتا ہے۔

خوجی صاحب کی تقریر ملاحظہ ہو۔

"بس تم ناقص العقل ہو۔ تم تو قد کو دیکھا چاہو اور یہاں لمبے آدمی کو لوگ بیوقوف سمجھتے ہیں۔ شیر کو دیکھو اور اونٹ کو دیکھو۔ سچ کہتا ہوں۔ یہ چور بدن کہلاتے ہیں۔ بندہ نے ایک بڑے قد آور جوان کو بچی بتائی۔ مارا چاروں شانے چت۔ آخر کے پانی بھی نہ مانگا۔ جی جناب دل لگی نہیں ہے۔ مقابلہ کردن از من بدیع صاحب بہادر دل لگی بازی نیست۔ اگر دل لگی بازی باشد ہر آئینہ امتحان بکنید و بس۔"

اردو اور فارسی کے اس امتزاج نے زبان کو مزاحیہ بنا دیا ہے جو ہماری تفریح کے لئے ایک انوکھی اور نادر چیز بن گئی ہے۔ ایک جملے کے بار بار دہرانے، ایک ہی لفظ کو رٹتے جانے سے اور بعض فقروں کو اس کے ساتھ ساتھ بڑھاتے جانے سے خواہ مخواہ ہنسی کا خیال پیدا ہونا شروع ہوتا ہے۔

مگر اس فسانۂ آزاد میں اُن کی سب سے بڑی خوبی کردار نگاری ہے۔ میاں آزاد اور پھر نقلی آزاد کا کیریکٹر۔ ثریا بیگم اور دیگر عورتیں۔ مزاحیہ کرداروں کی بھرمار جن میں خوجی سب سے ممتاز ہے اور شاید ظرافت کی دنیا میں یہ عجیب و غریب مخلوق دوبارہ پیدا نہیں ہوئی۔ اردو ادب میں خوجی اپنی مثال آپ ہی ہے۔ خوجی شروع سے لے کر اخیر تک ایک مسخرہ ہے۔ وہ اپنی پہلوانی اور شجاعت کے من گھڑت افسانے سناتا جاتا ہے۔ یہ افیم کی ڈبیا یعنی چنیا بیگم کی محبت میں محو ہے۔ اور افیون کی پینک میں گیدی گیدی پکارتا رہتا ہے۔ اُس کے کیریکٹر میں یہ دونوں خبط کی سی باتیں شامل ہیں جن پر تمام کتاب کے مزاح کا دارومدار ہے اور حق تو یہ ہے کہ خوجی بنتا بھی خوب ہے اور اس کے ہاں بھی مزاح بہت وسیع ہے۔

خواجہ بدیع الزماں صاحب پاگل خانے میں اناپ شناپ بک رہے ہیں۔

جیلر۔ اچھی کہی۔ تم پاگل نہیں ہو۔ غلط ہے

کلرک۔ یہ تو بے فائدہ یہاں آئے۔ تم پاگل ہو جی۔

خوجی۔ بلانے والے اور بھیجنے والے سب پاگل۔ میں شاعر ہوں اور شاعر پاگل نہیں ہو سکتا۔ کیا مجال ہے میں تو شاعر ہوں۔ مرے اشعار سنئے اور داد دیجئے ؎

پلا ساقیا مالوے کی افیم — کہ کر آؤں گلگشت باغِ نعیم
پیاسا کئی دن کا ہوں ساقیا — جھلک آبِ اسود کی جھٹ پٹ دکھا
نرالا ہے محفل کا کچھ آج رنگ — نہ کیوں زندگی سے طبیعت ہو تنگ
نہ مطرب نہ ساغر نہ مینا نہ چنگ — نہ چانڈو نہ افیوں نہ گانجا نہ بھنگ
کرم کر فقیروں پہ مائی ڈیَر — میں قربان جاؤں ذرا کم ہیئر

میاں آزاد اور خوجی ترکی کو جا رہے ہیں تو راستے میں جہاز میں خواجہ صاحب کا کردار اپنے صحیح معنوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اتنے میں جہاز کے ایک کونے سے آواز آئی کہ (او گیدی۔ نہوئی قرولی نہوا تمنچہ۔ ورنہ لاش پھڑکتی ہوتی اس وقت)

میاں آزاد کے پوچھنے پر یوں رقم طراز ہوئے:

خوجی (خو) یعنی خواجہ بدیع الزماں بدیع۔ اجی جاؤ بھی یہاں شکار ہاتھ سے جاتا رہا۔ واللہ گرفتار ہی کر لیا تھا۔ گیدی کو پاتا تو اتنی قرولیاں لگاتا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا مگر میرا پاؤں پھسل گیا اور وہ نکل گیا۔

آزاد۔ (مسکرا کر) یار آپ کی ہمیشہ کسر رہ جاتی ہے۔ خیر اب کی چپر غٹو کرنا گیدی کو۔ یہ تھا کون؟

خوجی۔ تھا کون؟ تھا کون؟ ہوتا کون؟ وہی بہروپیا مردود اور کس کو پڑی تھی بھلا۔

آزاد۔ بہروپیا

خوجی۔ جی ہاں بہروپیا۔ بڑا تعجب ہوا آپ کو۔

آزاد۔ بھئی تعجب ہاں کہیں لئے جاتا ہے۔ کیا یہ بہروپیا بھی جہاز پر سوار ہو لیا ہے۔ بڑا لاکو ہے بھئی۔

خوجی۔ سوار نہیں ہوا تو آیا کہاں سے۔ ٹھہر جا گیدی۔ تو خواجہ بدیع جو قرولیاں ہی نہ بھونک دوں تو بجا پیدا

برتاؤ دے کر۔ انشاء اللہ:

آزاد۔ کیا سوتے تھے خوجی یا پینک میں تھے۔

خوجی۔ خوجی کی ایسی تیسی مردود کی۔ پھر تم نے خوجی کہا ہم کو۔ کیوں جی؟

یہ ہیں ہمارے خواجہ صاحب۔ اکثر افیم کی تان میں۔ قرولیاں اور گیدی کے نعرے بلند کرتے رہتے ہیں۔ اپنے نام کو بڑھا چڑھا کے بیان کرتے ہیں۔ شجاعت و جرأت کے جھوٹے قصے دن رات سناتے رہتے ہیں۔ اکثر علمی و سیاسی بحث بھی کرتے ہیں۔ مزاح پیدا کرنے میں ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ۔ خود بھی ہنستے ہیں۔ اوروں کو بھی ہنساتے ہیں۔ اکثر بن بھی جاتے ہیں اور اپنی گنجی چاندی کو بڑھاتے ہیں۔ مگر ایک بات جو ہمیں نہیں بھولنی چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ یہ ایک مسخرے کا کیرکٹر ہے اور اس میں ایک نقص یہ بھی ہے کہ اس کا شروع سے لے کر انتہا تک کوئی نفسیاتی مطالعہ نہیں کیا گیا۔

لیکن ایسے کرداروں کی مدد سے سرشار نے اس وقت کے سماج کی ہو بہو تصویر کھینچی ہے۔ ان کے کرداروں میں زندگی ہے۔ وہ ہمارے سامنے زندہ انسانوں کی طرح بولتے چالتے۔ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ بعض جگہ مبالغہ اور مافوق الفطرت باتوں سے کام لیا گیا ہے۔ مکالمات کے لکھنے میں اور پرانے رسم و رواج پر چوٹیں لگانے میں سرشار اپنے تمام ہمعصروں سے بڑھ گئے ہیں اور ان کے سامنے رجب علی سرور کا فسانۂ عجائب بچوں کی سی بات معلوم ہوتا ہے۔

سوسائٹی کی تصویر انہوں نے ضرور دکھائی ہے۔ لیکن کیا اس تمام مزاح نگاری اور ظرافت سے ان کا مقصد اصلاح تھا۔ شائد نہیں سرشار نے تو محض تفریح طبع اور خوش گپیوں کے طور پر یہ تمام طویل قصے لکھے ہیں اور ان میں اغلباً دوسروں کی دکھتی ہوئی رگ کو پکڑنے کا جذبہ بھی کام کر رہا تھا اور کہیں کہیں تو فحش اور اخلاق سے گرے ہوئے مضامین بھی ملتے ہیں۔

لیکن پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد اس وقت کے ماحول کی تصویر ہے۔ اس میں زندہ کردار ہیں۔ رومان حقیقت۔ شادی۔ مرگ۔ علم و عمل سبھی کچھ ہے۔ ہمارے خواجہ بدیع الزماں بھی ہیں اور میاں آزاد بھی اور ہماری بھٹیاری بھی۔ مرزا ہمایوں فر بھی اور ہماری کنکر پھینکنے والی سپہر آرا بھی۔ قہقہے بھی ہنسی ہے اور تبسم زیر لب بھی۔ غرضیکہ سرشار کے ہاں ہر نوعیت کا مزاح ہے۔ عام زندگی میں جس طرح اور جن جن موقعوں پر مزاح ہو سکتا ہے۔ ان تمام پہلوؤں سے آپ کی واقفیت ہو جاتی ہے اور اردو ادب میں بحیثیت مزاح نگار ان کا اپنا ایک خاص مرتبہ ہے جو نظیر اکبر آبادی عظیم بیگ چغتائی اور مرزا فرحت اللہ بیگ اور دیگر موجودہ لکھنے والے بھی ان سے نہیں چھین سکے۔

(پشاور ریڈیو)

میکسم گورکی

میشا

میشا کو جب بھی گھر سے باہر جانے کی اجازت نہ دی جاتی تو وہ کبھی چین سے نہ بیٹھتا۔ سارے گھر میں پتنگے کی طرح کودتا ناچتا پھرتا۔ ہر ایک کے کام میں موقع بے موقع اپنی ٹانگ اڑاتا۔ یہ بڑے بوڑھے بھی ہمیشہ کسی نہ کسی غیر دلچسپ کام میں لگے ہی رہتے ہیں۔ اور اسی لئے وہ ہمیشہ بچوں کو ڈانٹ کر یہی کہتے ہیں

"ہٹو —— پریشان مت کرو، کام کرنے دو"

میشا نے بھی بارہا یہ جملہ اپنے ماں باپ سے سنا۔ ماں ہمیشہ ہی کسی نہ کسی کام میں مشغول رہتی، اور باپ سارا دن پڑھائی لکھائی میں مصروف رہتا۔ میشا کا اندازہ تھا کہ وہ کتابیں ضرور بیکار سی ہونگی جب ہی اسے پڑھنے کی اجازت نہ دی جاتی۔

موسم بہار سے کچھ دن قبل، ایک روز جبکہ موسم بیحد خراب ہو گیا تھا۔ تمام دن برف گرتی رہی۔ ایسے چار ناچار میشا کو گھر میں ہی رہنا پڑا۔ اس حالت میں وہ والدین کے لئے مستقل آزار بن گیا۔ اسکے باپ نے دریافت کیا

"میشا —— کیا تمہارا جی گھبراتا ہے؟"

"جی ہاں - بالکل جیسا کہ ارتھمیٹک کا سوال نکالتے وقت" میشا نے جواب دیا۔

"اچھا تو یہ نوٹ بک لو اس کو ڈائری کہتے ہیں۔ جو بات تمہیں اچھی اور دلچسپ معلوم ہو۔ اس میں لکھو۔"

"تو وہ کونسی اچھی اور دلچسپ باتیں ہونگی؟" میشا نے ڈائری لیتے ہوئے سوال کیا۔

"—— مجھے کیا معلوم" باپ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے ذرا ترش روئی سے جواب دیا۔

"کیوں؟ —— تم کیوں نہیں جانتے؟" میشا نے دوسرا سوال جڑا۔

"اس لئے کہ جب میں تمہاری طرح بچہ تھا تو کبھی اپنا سبق یاد نہ کرتا تھا اور ہمیشہ اپنے فضول اور بیکار سوالات سے اپنے بزرگوں کو تنگ کیا کرتا تھا —— سمجھے ——۔ اچھا اب ایک - دو - تین ہو جاؤ"

میشا تاڑ گیا کہ باپ کا اشارہ اس کی ہی طرف ہے۔ اور وہ اس وقت اس کی بیکار باتوں میں الجھنا نہیں چاہتا لیکن ان سب کے باوجود اس نے باپ کی آنکھوں میں رحم اور محبت کی جھلک دیکھی۔ اس لئے اس نے چلتے چلتے ایک سوال اور کیا۔

"اچھا —— تو وہ دلچسپ باتیں کون کریگا؟"

"تم خود —— لو اب چل دو - ایک اچھے بیٹے کی طرح۔ مجھے ابھی بہت سا کام کرنا ہے"

میشا خاموشی سے کمرہ چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ نوٹ بک میز پر رکھدی، اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد لکھنے لگا۔

"یہ ڈائری ہے ـــــ ڈیڈی نے مجھے دی ہے۔ جو بات میں اس میں لکھونگا وہ اچھی اور دلچسپ ہوگی"۔

پھر اس نے قلم ایک طرف رکھ دیا اور کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھنے لگا۔ ساری جانی پہچانی چیزیں۔ ان میں کوئی چیز بھی تو ایسی نظر نہ آئی جو کسی دلچسپی کا باعث ہو۔ وہ اٹھا اور سیدھا باپ کے کمرے کی طرف گیا۔

"تم پھر نازل ہو گئے" باپ نے ترشی سے کہا۔

"دیکھو ـــ میں نے اپنی کتاب پر کیا لکھا ہے" بیتّا نے ڈائری دکھاتے ہوئے کہا "کیا یہ ٹھیک ہے؟"

"ہاں ــــ ہاں ــــ ہاں" باپ نے غصہ سے جواب دیا۔

"اچھا۔ اب آگے کیا لکھوں؟"

"جو تمہارا جی چاہے ـــ کچھ سوچو اور لکھو، کوئی نظم ہی ـــ"

"نظم ــــ!" بیتّا نے تعجب انگیز لہجے میں کہا "لیکن کونسی نظم؟"

"کوئی سی نہیں ــــ خود بناؤ اور لکھو۔ چلو اب یہاں سے نکلو" باپ نے تنگ آکر زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دیا اور دروازہ بند کر لیا۔

"باپ کا یہ برتاؤ۔ محبت اور ہمدردی کے تمام اصولوں کے خلاف تھا" بیتّا نے سوچا۔ اس برتاؤ سے اسے بہت دکھ پہنچا۔ وہ اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ اور کافی دیر خاموش بیٹھا رہا۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔ اس کا ذہن پراگندہ تھا۔ ماں باورچی خانہ میں کسی کام میں لگی ہوئی تھی اور وہاں اسے جانے کی اجازت نہ تھی۔

"نہ جانے ان ماں باپوں کو کیا ہوتا ہے جو بچوں کو ہمیشہ اچھی چیزوں سے دور ہی رکھتے ہیں" وہ سوچنے لگا۔ لیکن اسکی سمجھ میں کوئی معقول وجہ نہ آئی۔ باہر سڑک پر ہر طرف کہر دھوئیں کے مانند چھایا ہوا تھا۔ اس لئے وہ باہر بھی نہ جا سکتا تھا۔ آخر وہ کیا کرے۔ لیکن یکایک اس کی نظر گھڑی پر پڑی ــــ ابھی تو نو ہی بجے ہیں۔ پھر وہ مسکرایا اور نوٹ بک پر جھک گیا۔

THERE IS A CLOCK ON THE WALLITS HANDS

LIKE WHISKERS RISE AND FALL

"واہ ــــ کیا اچھا شعر بنا" وہ اپنی اس کامیابی پر خوشی سے اچھل پڑا۔ اور چلاتا ہوا باورچی خانہ کی طرف دوڑا۔

"ماں ــــ ماں ـــ دیکھو میں نے کیسا عمدہ شعر کہا"

"نو ــــ" ماں نے جھاڑن گنتے ہوئے کہا "جاؤ مجھے کام کرنے دو......... دس ..... گیارہ"

بیتّا نے جھٹ ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور دوسرے ہاتھ سے ڈائری آنکھوں کے بجائے ناک پر اڑا دی۔

"بارہ .... تیرہ ......"

"ہائے اللہ ـــ تم مجھے ڈھکیلے دے رہی ہو"

ماں نے ٹالنے کی غرض سے نوٹ بک لی اور پڑھ کر بولی "ضرور تمہارے باپ نے مدد دی ہے ــــ خیر جاؤ فضول پریشان مت کرو ــــ اور کچھ کرو"

"لیکن کیا کروں؟"

"اور شعر لکھو ــــ"

"شعر —— نہیں اب میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا"

"اچھا لکھو —— گھڑی ٹک ٹک کرتی ہے........ اور اسی طرح آگے"

بیشا دوڑتا ہوا کمرے میں آیا اور لکھنے لگا

"THE LITTLE CLOCK TICKS AWAY, AND I AM BORED ALL THE DAY."

یہ سچ بھی تھا۔ بیشا واقعی بہت آزردہ تھا۔ پھر بھی وہ شعر کہنے کی خوشی میں اچھلتا ہوا باپ کے کمرہ کی طرف دوڑا اور دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا۔

"کون ہے؟" باپ نے دریافت کیا۔

"جلدی دروازہ کھولو —— میں ہوں —— میں نے شعر لکھے ہیں"

"بہت اچھا۔ شاباش شاباش.... جاؤ اسی طرح اور لکھو" باپ نے دروازہ کھولے بغیر ہی جواب دیا۔

"لیکن میں سنانا چاہتا ہوں"

"پھر سنانا —— ابھی جاؤ"

"نہیں —— میں ابھی سناؤں گا" بیشا جھکا اور دروازہ کے سوراخ سے بلند آواز میں پڑھنے لگا تاکہ اس کا باپ سن لے۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کی آواز گنبد پر اخروٹ کے مانند تھی۔ اس لئے کہ باپ نے بالکل ہی چپ سادھ لی۔ بیشا کو بہت دکھ پہنچا۔ وہ اپنے کمرے میں آ کر بڑی دیر تک خاموش کھڑا ہوا اپنی گرم پیشانی کو کھڑکی کے ٹھنڈے شیشے سے رگڑتا رہا۔ اسے قدرے سکون محسوس ہوا۔ وہ پھر اپنی میز پر آ کر بیٹھ گیا اور لکھنے لگا۔

"ڈیڈی نے مجھے دھوکا دیا۔ انہوں نے بتایا کہ ڈائری لکھنا ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ لیکن یہ قطعی جھوٹ ہے۔ انہوں نے یہ سب مجھے دور رکھنے کے لئے کہا۔ کل جب میں ان کے چاندی کے سگریٹ کیس سے کھیل رہا تھا تو انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا اور جب بینا نے چینی کا پیالہ توڑ دیا تو بولے کوئی ہرج نہیں اور آجائیگا۔ اور اگر کہیں مجھ سے ٹوٹ جاتا تو میں پھر کیا تھا۔ شامت ہی تو آجاتی"

اور اس خیال سے کہ ماں باپ اس کے ساتھ کتنا ناانصافی کا برتاؤ کرتے ہیں وہ قریب قریب روندھا ہو گیا۔ اسکے والدین کتنے اچھے تھے۔ لیکن پھر بھی اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کر سکتے تھے۔ وہ سوچنے لگا۔

"کیا ساری دنیا میں ماں باپ ایسے ہی ہوتے ہیں؟"

وہ پھر اٹھا اور کھڑکی کے قریب گیا۔ اس نے دیکھا کہ کھڑکی کے کارنس پر ایک ننھی گوریا دھوپ میں پر پھیلائے اپنے گیلے پر سکھا رہی ہے۔ اور بیشا کے شاعرانہ دماغ نے سوچنا شروع کیا۔

WITH LEGS LIKE TOOTHPICKSAND BEADY THIS BIRD HIS WHISKERS LIKE DADDY EYESLIPON MY WORD

پھر اس کے شاعرانہ خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ اپنی میز پر آیا اور لکھنے لگا۔

"شعر کہنا بہت آسان ہے۔ بس کسی چیز کی طرف دیکھو اور الفاظ خود بخود شعر کی شکل میں ڈھلتے جائینگے میں بھی

ڈیڈی کی طرح کتابیں لکھ سکتا ہوں۔ شعروں میں۔ اور مجھے ڈیڈی سے مدد لینے کی بالکل ضرورت نہیں۔ بس ذرا الفاظ کے ہجے یاد کرنے پڑینگے۔ شعر کہنا کوئی بہت بڑا کام نہیں...... ماں...... کاں...... شاں...... ہاں یہ سب شعر ہی تو ہوتے۔ میں ان سے پوری نظم بنا سکتا ہوں۔ لیکن میں ایسا ہرگز نہیں کرونگا۔ اور نہ میں ڈائری ہی لکھونگا۔ ماما اور ڈیڈی کو میرے کاموں سے دلچسپی نہیں...... خیر نہ سہی چلو چھٹی ہوئی" بیتشا اس خیال سے یکایک آزردہ ہوگیا۔

اتنے میں اس کی استانی اگزینا آگئی۔

"گڈ مارننگ بے بی...... ارے تم رو کیوں رہے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

بیتشا ذرا اپنی آن رکھنے کے لئے تن گیا۔ اور باپ کی سی بھاری آواز بنا کر بولا۔

"میرے کام میں مت دخل دو" اور پھر لکھنے لگا۔

"ڈیڈی اگزینا کو نکمی گڑیا کہتے ہیں"

"بیتشا کیا لکھ رہے ہو" اگزینا نے دریافت کیا۔

"ڈائری —— میں اپنے تمام دلچسپ خیالات اس میں جمع کر رہا ہوں"

"اچھا —— یہ بات ہے" اگزینا نے نوٹ بُک پر جھکتے ہوئے کہا۔

"ذرا دیکھوں تو کیا لکھا ہے تم نے"

"ابھی کچھ نہیں۔ صرف چند شعر"

"اچھا تو آپ شاعر بھی ہو گئے —— ذرا غلطیاں تو دکھاؤ...... لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ڈیڈی نے انہیں مدد دی ہے"

"ڈیڈی نے ——" بیتشا کو ایک دم غصہ آگیا۔ "کسی کو بھی میرا یقین نہیں آتا۔ اگر ایسا ہی ہے تو میں اب کوئی کام نہیں کرونگا"

"کیوں؟ ——" اگزینا نے سوال کیا۔

"اس لئے کہ میں کرنا نہیں چاہتا" بیتشا نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

یکایک اگزینا کی نظریں اُن الفاظ پر پڑیں جو بیتشا نے اس کے بارے میں لکھے تھے۔ اس کے چہرے کا رنگ یاقوتی ہوگیا۔ وہ لپک کر آئینے کے سامنے گئی۔

"تو تم نے میرے بارے میں بھی لکھا ہے۔ کیا تمہارے ڈیڈی نے میرے متعلق ایسا ہی کہا؟"

"کیوں؟ —— تم سمجھتی ہو کہ وہ تم سے ڈرتے ہیں"

اگزینا ایک بار پھر سنجیدہ ہوگئی۔ اور آئینہ کی طرف مڑی۔

"کیا تم اپنا سبق یاد کرنا نہیں چاہتے؟"

"جی —— نہیں"

"اچھا۔ میں ممی سے دریافت کرتی ہوں" یہ کہتی ہوئی اگزینا کمرے سے باہر نکل گئی۔

بیتشا نے آنکھ کے گوشوں سے دروازہ تک اس کا تعاقب کیا۔ اور پھر اپنی ڈائری پر جُھک گیا۔ اور لکھنے لگا۔

"میں نے اگزینا کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جیسا ممی ڈیڈی کے ساتھ کرتی ہیں۔ اب وہ مجھے ہرگز پریشان نہ کریگی

اگر کوئی مجھے اچھا نہیں سمجھتا تو نہ سمجھے۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ میں ڈیڈی کی طرح تمام تمام دن اپنی نوٹ بک میں لکھتا رہونگا۔ یہانتک کہ کھانا، پینا، اور سونا تک چھوڑ دونگا۔ بس ہر وقت لکھتا ہی رہونگا۔ اور پھر ممی پریشان ہو کر کہیں گی بیٹا اتنا زیادہ مت پڑھو، اس سے تمہاری تندرستی خراب ہو جائے گی۔ لیکن میں اُن کی بالکل پرواہ نہ کرونگا جب کوئی مجھے اچھا نہیں سمجھتا تو پھر میں کیوں انکی بات سنوں؟"

بیٹنا اتنا ہی لکھنے پایا تھا کہ اس اگیز بینا کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ اور خاموشی سے اس کے ہاتھ سے ڈائری لیکر پڑھنے لگی۔

"یہ سب کیا ہے؟ — چلو میں تمہارے ڈیڈی کو دکھلاتی ہوں۔" اور وہ انکے کمرے کی طرف چل دی۔

"اب شاید مار پڑیگی۔" بیٹنا ڈر گیا۔ اور پھر اگیز بینا کی طرف مخاطب ہوا۔

"تو تم نے ممی سے میری شکایت کی؟"

"ہاں — تم نے میرا حکم جو نہیں مانا —"

"حکم — میں کوئی گھوڑا ہوں۔ میں ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتا ہوں۔" بیٹنا اور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ملازمہ داخل ہوئی اور بتلایا کہ ڈیڈی نے اس کو بلایا ہے۔

"ادھر تشریف لائیے جناب۔" ڈیڈی نے نوٹ بک اٹھاتے ہوئے کہا۔ ان کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ اور ممی ایک طرف صوفہ میں دھنسی ہوئی تھیں۔ بیٹنا تاڑ گیا کہ ایسا گہرا خطرہ نہیں ہے۔ اس لئے وہ خاموشی سے باپ کے قریب آگیا۔

"تم بہت شریر لڑکے ہو — کیوں؟"

"جی ہاں۔" بیٹنا نے جواب دیا

"لیکن کیوں؟"

"اس لئے...... اس لئے...... میں نہیں جانتا... آپ مجھ سے ناراض رہتے ہیں۔ ماما پیار نہیں کرتی۔ اگیز بینا تو ہر وقت ہی ڈانٹتی رہتی ہیں۔"

"تو اس لئے تم ناراض ہو گئے؟"

"جی اسی لئے۔"

"نہیں — نہیں ناراض نہیں ہونا چاہئے ہم تم کو ناراض کرنا نہیں چاہتے۔ وہ دیکھو تمہاری ممی ہنس رہی ہیں۔"

"لیکن اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"میں تمہیں ابھی بتلاتا ہوں۔ ذرا ٹھیرو۔"

"لیکن میں تو ابھی جاننا چاہتا ہوں۔" بیٹنا نے ضد کی۔

"دیکھو — تم بہت ہی شریر لڑکے ہو۔" باپ نے اس کو گود میں اٹھالیا۔ "اب ہمیں ذرا سنجیدگی سے بات کرنی چاہئے۔"

"بہت اچھا —" بیٹنا نے ذرا سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔

"دیکھو — کوئی بھی تم کو ستانا نہیں چاہتا۔ یہ صرف موسم کی خرابی کی وجہ ہے۔ اگر موسم اچھا رہتا تو تم مزے سے

باہر کھیلتے پھرتے اور پھر تم کو ہر چیز اچھی معلوم ہوتی۔ اور تم نے اپنی ڈائری میں بہت سی بیکار باتیں بھی لکھی ہیں۔"

"آپ ہی نے تو لکھنے کو کہا تھا۔"

"بیٹا۔ میں نے بیکار باتیں لکھنے کو تھوڑا ہی کہا تھا۔"

"شاید ـــ مجھے اس وقت ٹھیک یاد نہیں۔"

ماں ہنسی ضبط کرتی ہوئی صوفے سے فلش، دوسرے کمرے کی طرف روانہ ہوگئی۔ اس لئے کہ وہ "کافی" کی کیتلی اسٹو پر رکھ کر بھول آئی تھی۔ لیکن بیتّا نے دیکھ لیا کہ ماں ہنس رہی تھی۔ گو اپنی ہنسی ظاہر کرنا نہ چاہتی تھی۔

"یہ بڑے بوڑھے بھی کیا ہنستے ہیں۔" بیتّا نے سوچا۔

باپ نے بھی اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اور مسکراہٹ کو دباتے ہوئے کہا۔

"بیٹا ـــ اچھا لکھنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ میں بھی اکثر لکھتے لکھتے بہت سی بیکار باتیں لکھ جاتا ہوں۔ خیر ـــ اب بہتر یہ ہے کہ تم ڈائری لکھنا بند کر دو۔"

"بہت اچھا ـــ" بیتّا نے ایک کاغذ پر لال نیلی لکیریں بناتے ہوئے کہا۔ "یہ کام بھی سبق کی طرح غیر دلچسپ ہے۔"

"چلو ـــ اب ہم دونوں کو اگر تیّا سے معافی مانگنی چاہئے۔ کیونکہ ہم نے جو کچھ کہا اور لکھا وہ اچھا نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ اسکی ناک چپٹی اور چھوٹی ہے لیکن ہمیں اس کا احساس دلانا نہیں چاہئے۔ الفاظ سے تو وہ درست ہونے سے رہی۔"

"ٹھیک ـــ" بیتّا نے متانت سے جواب دیا۔

یہ تھا بیتّا کی ڈائری کا دلچسپ انجام۔

(مترجمہ جاوید منظر)

ایوان فیدوٹیف

سوویٹ یونین میں تعلیم

- انقلاب سے پہلے صرف ۸ ، ۷ فی صدی بچے اسکول جاتے تھے
- انقلاب کے بعد ۱۰۰ فی صدی بچے اسکول جاتے ہیں
- انقلاب سے پہلے چالیس سے زیادہ قوموں کے پاس اپنی تحریری زبان نہ تھی
- انقلاب کے بعد ہر قوم کے پاس تحریری زبان ہے
- سنہ ۱۹۱۹ء تا سنہ ۱۹۳۱ء ۶۰ ہزار نئے اسکول کھولے گئے
- سنہ ۱۹۲۱ء میں سنہ ۱۹۱۰ء کی بہ نسبت اسکولی طالب علموں کی تعداد ۵ گنی زیادہ ہوگئی

انقلاب سے پہلے	انقلاب کے بعد
۹۱ اعلیٰ تعلیمی ادارے اور ایک لاکھ ۱۲ ہزار طالب علم	۸۰۰ تعلیمی ادارے اور ۶ لاکھ ۷۰ ہزار طالب علم
تھوڑے سے ٹیکنیکل اسکول اور ۳۵ ہزار طالب علم	تین ہزار چار سو ٹیکنیکل اسکول اور ۱۲ لاکھ طالب علم

سوویٹ یونین نے تیس سال کے اشتراکی نظام میں جو اعلیٰ ترین چیزیں ایجاد کی ہیں۔ اُن میں سے ایک یہاں کا تعلیمی نظام ہے جسے ساری دنیا میں شاندار قرار دیا گیا ہے۔

انقلاب سے پہلے روس میں تعلیم کی برکت آبادی کی محض ایک چھوٹی سی اقلیت کو میسر تھی اور وہ اقلیت دولتمند طبقہ پر مشتمل تھی بسنہ ۱۹۱۴ء کے سرکاری اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ صرف ۷ ، ۸ فیصدی بچے اسکول جایا کرتے تھے جو قومیں زار کی غلام تھیں۔ اُن میں تعلیم کو خاص طور سے نچلی سطح پر رکھا گیا تھا اور اس کی اشاعت میں جان بوجھ کر رکاوٹیں پیدا کی گئی تھیں۔ زار کے روس میں چالیس سے زیادہ قوموں کے پاس اپنی کوئی تحریری زبان نہیں تھی۔

اکتوبر سنہ ۱۹۱۷ء کے اشتراکی انقلاب نے روس کی قوموں پر علم اور ادب کا دروازہ کھول دیا۔ تعلیم کی باگ ڈور حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لی اور اسکولوں کو یہ کام سپرد کر دیا گیا کہ وہ نئی سوسائٹی کی تعمیر کے لئے تعلیم یافتہ اور

روشن خیال شمار پیدا کریں۔

سوویٹ یونین کے رہنما اسٹالن نے کہا کہ ہم اپنے تمام کسانوں اور تمام مزدوروں کو مہذب اور تعلیم یافتہ بنانا چاہتے ہیں اور کچھ عرصہ میں ہم ضرور اس مقصد کو حاصل کر لیں گے۔

سوویٹ حکومت اپنی آمدنی کا بیش از بیش حصہ لوگوں کے تعلیمی اور تہذیبی معیار کو بلند کرنے میں صرف کر رہی ہے۔ گذشتہ جنگ سے پہلے دس یا بارہ سال کے عرصہ میں ساٹھ ہزار نئے اسکول کھولے گئے۔ جن میں مجموعی طور پر دو لاکھ طالب علم تھے۔ انقلاب سے پہلے کے مقابلے میں ۱۹۴۱ء میں اسکول جانے والے شاگردوں کی تعداد پانچ گنی زیادہ تھی۔

نہ صرف ابتدائی اور ثانوی تعلیم کو ترقی نصیب ہوئی بلکہ اعلیٰ تعلیم کو بھی۔ انقلاب سے پہلے روس میں اعلیٰ تعلیم کے صرف ۹۱ ادارے تھے۔ جن میں ایک لاکھ بارہ ہزار طالب علم تھے اور اب اعلیٰ تعلیم کے آٹھ سو ادارے ہیں جن میں چھ لاکھ ستر ہزار طالب علم موجود ہیں ٹیکنیکل اسکولوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی اور اب پورے سوویٹ یونین میں تین ہزار چار سو ٹیکنیکل اسکول ہیں۔ اس وقت ان اسکولوں میں بارہ لاکھ طالب علم تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ یہ تعداد انقلاب سے پہلے کی بہ نسبت ۲۵ گنی زیادہ ہے۔

سوویٹ یونین میں تمام اسکول اور تعلیمی ادارے حکومت کی ملکیت ہیں۔ اس سے تعلیم اور تربیت میں ایک خاص ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور اسکولوں اور تعلیمی اداروں کی منصوبہ بندی ہو سکتی ہے۔ ان کے لئے ضروری ساز و سامان مہیا کرنے میں آسانی ہوتی ہے اور نصاب تعلیم کو یکساں بنانا اور اس میں تسلسل پیدا کرنا سہولت آمیز ہو جاتا ہے۔ سرکاری نظامِ تعلیم کی بدولت سوویٹ یونین کے تمام باشندوں کو اپنے تعلیمی حقوق عمل میں لانے کا موقع مل جاتا ہے۔ سرکاری منصوبے بندی کی بدولت وہاں کے نظام میں اب کسی قسم کا انتشار نہیں رہا اور نہ اب تعلیم کا دارومدار لوگوں کی خیرات پر ہے۔

سوویٹ یونین میں تمام لوگوں کے لئے سات سال تک تعلیمی ادارے میں جانا لازمی ہے۔ اس تعلیم کے تمام اخراجات حکومت برداشت کرتی ہے۔ سوویٹ یونین میں جتنی قومیں شامل ہیں۔ ان سب کو تمام معاملات میں مکمل مساوات حاصل ہے۔ چنانچہ تعلیم کے میدان میں بھی ایسا ہی ہے۔ سوویٹ یونین میں شامل ہر ملک میں وہاں کی مادری زبان کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے۔ تعلیم کے سلسلہ میں عورتوں اور مردوں کو مکمل مساوات عطا کی گئی ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے عام تعلیم کا معیار ایک ہی ہے۔ سوویٹ یونین میں تعلیم کا بہت ہی ہم آہنگ نظام قائم کیا گیا ہے۔ جس کے تحت ایک طرف تو ایسے اسکول ہیں جن میں عام تعلیم اور خاص خاص پیشوں کی تعلیم دی جاتی ہے اور دوسری طرف اعلیٰ تعلیم کے اداروں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ عام تعلیمی اداروں کے ضمن میں مندرجہ ذیل اسکول آتے ہیں:-

1 - بچوں کے لئے ابتدائی اسکول جہاں سات سے لے کر دس سال کی عمر تک کے بچے پڑھتے ہیں اور چار سال تک تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہاں کا نصاب سات سالہ اسکول کے، تین اور ثانوی اسکول کے چار درجوں کے نصاب سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

2۔ سات سالہ اسکول (جونیر سکنڈری) یہاں ۷ سے ۱۴ سال کی عمر تک کے لڑکے پڑھتے ہیں۔ یہاں کا نصاب ثانوی اسکول کے اوّلین سات درجوں کے نصاب سے ہم آہنگ ہے۔

3۔ ثانوی اسکول۔ یہاں ۷ سے لے کر ۱۶ سال تک کی عمر کے لڑکے پڑھتے ہیں اور دس سال تک تعلیم ہوتی ہے۔ پہلے چار سال میں ابتدائی اسکول کا پروگرام مکمل ہوتا ہے اور دوسرے تین سال میں جونیر سکنڈری اسکول کا۔ جنگ کے زمانے میں خاص طور پر ملازمت پیشہ نوجوانوں کے لیئے اسکول کھولے گئے تھے تاکہ وہ ملازمت ترک کئے بغیر اپنی فرصت کے اوقات کام میں لا کر ثانوی تعلیم مکمل کر سکیں۔ عام تعلیمی ادارے ہیں۔ وہ اسکول بھی شامل ہیں جو خاص طور سے اندھوں، بہروں اور گونگوں کے لئے کھولے گئے ہیں یا دماغی لحاظ سے ناکارہ بچوں کے لئے۔

سات سالہ اسکول سے نکلنے کے بعد طالب علم اگر چاہے تو کسی ایسے ثانوی اسکول میں داخل ہو سکتا ہے جس میں کسی فن یا علم کی خاص تعلیم ہوتی ہے۔ جیسے ٹیکنیکل، میڈیکل، ٹیچرس ٹریننگ اسکول، موسیقی یا تھیئٹر کے اسکول ان اسکولوں میں تین یا چار سال تک کا نصاب ہوتا ہے۔ یہاں ایک معقول درجے اور درمیانی درجے کے اسپیشلسٹ (خاص خاص فن یا علم کے ماہر) تیار کئے جاتے ہیں۔

سکنڈری اسکول سے نکلنے کے بعد طلباء اعلٰے تعلیمی ادارے میں داخل ہونے کے مجاز ہوتے ہیں۔ مثلاً یونیورسٹی یا انسٹی ٹیوٹ یا اکیڈمی۔ یہاں چار سے لے کر 8 سال تک کا کورس ہوتا ہے۔ تمام وہ طلبا جو اپنے مضامین میں اچھا کام دکھلاتے ہیں۔ سرکاری وظیفہ پاتے ہیں۔

سوویٹ یونین کے اسکولوں میں بچوں کے مختلف ادارے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً بچوں کے کتب خانے اور ریڈنگ روم، کلب، بچوں کے سینما اور تھیئٹر۔ قدرتی زندگی کا تجزیہ کرنے والے چھوٹے بچوں کے تعلیمی مرکز، نوخیز ٹیکنیکل ماہرین کے مرکز، بچہ سیاحوں کے حلقے، بچوں کے تہذیبی پارک اور آرام گاہیں۔ اس قسم کے ادارے سوویٹ یونین میں جتنی تعداد میں پائے جاتے ہیں اتنے دنیا کے کسی بھی ملک میں نہیں پائے جاتے۔ بعض ادارے تو ایسے ہیں جو دوسرے ملکوں میں سرے سے پائے ہی نہیں جاتے۔

سوویٹ یونین کے نظامِ تعلیم میں بالغوں کے لئے بھی کچھ خاص ادارے ہیں۔ مثلاً کلب، تہذیب محل، پنچایتی کھیت، اور دیہی کلب، دیہی مطالعہ گاہیں، تہذیبی پارک اور آرام گاہیں، کتب خانے، میوزیم اور لکچر بیوریو۔

یہ ہے سوویٹ یونین کا نظامِ تعلیم۔ اس میں تمام باشندوں کے لیئے تعلیم حاصل کرنے کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ اس سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنی صلاحیتوں میں اضافہ اور اپنی ذہنی دلچسپیوں کی تسکین کر سکتے ہیں۔

(مترجمہ طفیل احمد)

سلطانہ مہر

گیت

نندن دیپ جلائے پگلی پائے گھور اندھیرا
کون کہے اب اسے ہیلی، انت یہی ہے تیرا

رین کی گودی خالی کر کے چاند ستارے بھاگے
اندھیارے ہیں پیچھے پیچھے جیوتی آگے آگے
ہوتے ہوتے نینوا سے اوجھل ہوا سویرا

چھایا گھور اندھیرا
انت یہی ہے تیرا

دُور دُور تک ایک اداسی بیٹری بسی اِک چھایا
دھرتی سے آکاش تک اُڑ کر آشا نے کیا پایا
چاروں کھونٹ چلی اندھیاری چنتاؤں نے گھیرا

چھایا گھور اندھیرا
انت یہی ہے تیرا

کون چُنے اب ٹوٹے تارے؟ جوت کہاں سے آئے
کون گگن پر سیج بچھائے؟ پھول تو ہیں مرجھائے
کون ہے جو اس نگری میں اب آکر کرے بسیرا؟

نندن دیپ جلائے پگلی پائے گھور اندھیرا
کون کہے اب اسے ہیلی انت یہی ہے تیرا

اختر ہوشیارپوری

اجنبی

جب کہیں ملتے ہیں دو دوست تو دیکھا ہے یہی
گھنی پلکوں پہ سرک آتی ہیں لاکھوں یادیں
دیکھتے دیکھتے لوٹ آتی ہیں بیتی گھڑیاں
گزرے ایام دبے پاؤں پلٹ آتے ہیں
اک دن اُس سے کبھی یونہی اپنی ملاقات ہوئی
اور کئی ڈوبے ہوئے تارے افق پر اُبھرے
جن کی تابانی سے ہر سمت چراغاں تھا کبھی
زندگی پیکرِ انوار نظر آتی تھی
وہ حسیں لمحے جو آنکھوں میں مری تیر گئے
جن سے امید کا دامن کبھی وابستہ تھا
جن کی آغوش میں ہم راتوں کی تنہائی میں
آرزوؤں کے جواں خواب بُنا کرتے تھے
اور میں اُس کی نگاہوں کا سہارا پا کر
زلفِ شبگوں کی گھنی چھاؤں میں سو جاتا تھا

یہ مری نیند گراں گزری دلِ عالم پر
میں مگر بے خبرِ رنگِ جہاں سوتا رہا
اک حزیں صبح کو جب آنکھ کھلی تو دیکھا
میرے خلوت کدے میں کوئی نہیں۔ وہ بھی نہیں
جیسے گلزار میں ہر سمت خزاں آتے ہی
پتے گرتے ہیں حسیں پھول بکھر جاتے ہیں
اور پلٹ جاتا ہے یوں قافلۂ نکہت و رنگ
جیسے اس رہ پہ اندھیرے میں چلا آیا ہو
اور اس راہ پہ منزل کا نشاں کوئی نہیں
اس نے پھر مجھ کو کچھ اُن نظروں سے دیکھا جیسے
وہ کبھی مجھ سے مرے غم سے شناسا ہی نہ تھی
اور میں درماندہ مسافر تھا جو تاریکی میں
اپنے رستے سے بہت دور بھٹک آیا تھا
اور کسی اجنبی منزل کا نشاں پوچھتا تھا

ابنِ انشا

انتہائے ابتدا

کردار

کشوری :- عمر ۵۵ سال ، فربہ اندام - گنجا
لچھمی :- کشوری کی بیوی - عمر ۴۵ سال - بڑی سلیقہ شعار عورت ہے
نین سکھ :- ایک پڑوسی - کشوری کا ہم عمر - دُبلا پتلا - بڑی بڑی مونچھیں - نظر بہت کمزور ہے -

منظر :- ایک وسیع باورچی خانہ - دہنے ہاتھ آتشدان - کچھ کرسیاں چوکیاں اور میز - ایک طرف ایک الماری جس پر گراموفون رکھا ہے - پُشت پر ایک دروازہ اور دروازے کے بائیں ہاتھ ایک کھڑکی - دروازے کے دہنے ہاتھ ایک میز جس پر الارم ٹائم پیس رکھا ہے - ایک کھونٹی سے طنبورہ لٹک رہا ہے - میز پر جھوٹے برتن پڑے ہیں - آتشدان کے دہنے ہاتھ ایک کوٹھڑی ہے جس میں ٹوٹی پھوٹی چیزیں پڑی رہتی ہیں - چھت سے بجلی کا ایک بلب لٹک رہا ہے - سامنے کی دیوار پر گتے کی ایک تختی نظر آ رہی ہے - جس پر جلی حروف میں لکھا ہے - "آج کا کام کل پر نہ چھوڑو" - تیسرے پہر کا وقت ہے -

کشوری (دروازے کے پاس والی میز پر بیٹھا داڑھی مونڈ رہا ہے) لچھمی ! لچھمی ! ادھر آؤ تو - ! دیکھو حجامت کے لئے یہ کیا پانی دیا ہے تم نے - برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا ہے - اسے گرم کر دو - بہری ہو گئیں کیا ؟

لچھمی (ادھر اُدھر کمرے میں کام کرتی پھر رہی ہے) میں اس وقت کام کر رہی ہوں - تم خود ہی اٹھ کر کر لو -

کشوری - بہت خوب ! تو گویا یہ بھی میرا ہی کام ہے - جتنا کام تم دن بھر میں کرتی ہو گی - اس سے تگنا کام کرنا پڑتا ہے مجھے - اس پر بھی تمہارا یہ حال ہے -

لچھمی - اور تمہارا یہ حال ہے کہ مجھ سے آدھا کام بھی تمہیں کرنا پڑے تو غش کھا جاؤ - یہ حالت ہو جائے کہ شام کو چار مزدور منگانے پڑیں تمہیں اٹھانے کے لئے -

کشوری - سچ ؟

لچھمی - ہاں سچ کہہ رہی ہوں -

کشوری ۔ تم سے آدھا۔

لچھمی ۔ ہاں ۔ بلکہ آدھے سے بھی کم۔

کشوری ۔ چار مزدور بلانے پڑیں نہ؟

لچھمی ۔ ہاں پورے چار۔

کشوری (درشتی سے) لچھمی! میں تم سے کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ اپنا بھرم نکال لو۔ تمہارا کام میں کر لیتا ہوں۔ تم ذرا میرا کام کر دیکھو۔ چند گھنٹے کے لئے ہی سہی ۔ لیکن تم بھلا یہ کب سے کو ماننے لگیں۔ میں بھی دیکھ لوں گا کتنے پانی میں ہو تم ــــ میرا کام تمہیں ایک دن بھی کرنا پڑے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے۔

لچھمی ۔ جاؤ ۔ اور جا کر مشین پر باقی کا چارہ کاٹ لو۔ ابھی تو کچھ روشنی ہے۔ پھر سورج غروب ہو جائے گا۔ کچھ نظر نہیں آئیگا

کشوری ۔ چھوڑو جی۔ کل دیکھا جائے گا اور ویسے آج تم ہی یہ کام کیوں نہ کر دیکھو۔ گھر کا کام میں سنبھال لوں گا منظور ہے؟

لچھمی ۔ مجھے منظور ہے۔

کشوری ۔ اچھا تو بولو ۔ گھر کا کیا کیا کام کرنا ہے۔

لچھمی ۔ بچھیا کو چارہ ڈالنا ہے ۔ پانی پلانا ہے ۔ مرغیوں کے آگے چوگا ڈالنا ہے۔ کھانا پکانا ہے۔ کپڑے دھونے ہیں اور ــــ سینے ہیں۔

کشوری ۔ سینے ہیں۔ بہت خوب ۔ دیکھی ہے تمہاری سلائی ۔ میری واسکٹ سی ہے نا تم نے؟ بازار سے گزرتا ہوں تو لوگ دیکھ دیکھ کر تالیاں پیٹتے ہیں۔

لچھمی ۔ خیر ــــ تو میں جاتی ہوں ۔ تم گھر کا کام نمٹاؤ۔

کشوری ۔ نمٹا لوں گا جی ــــ تم جاؤ ۔ دنان ہو جاؤ ۔ کام تب ہوتا ہے اگر انسان ٹھنڈے سبھاؤ سے لے تمہاری طرح چڑ چڑ کرتے رہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔

لچھمی ۔ بچھیا کو چارہ دیتا ہے اور پانی بھی دکھاتا ہے سنتا؟

کشوری (جی میں تو خائف ہے کہ یہ تو واقعی جانے پر تلی ہوئی ہے ــــ بظاہر) اجی اب جاؤ بھی ۔ کیوں سر کھا رہی ہو

لچھمی ۔ اور میرے پیچھے کلموہی ایشری کو گھر میں قدم رکھنے دیا تو دیکھ لینا۔

کشوری ۔ کون ایشری۔

لچھمی (تیز ہو کر) ہونہہ ــــ کون ایشری ــــ! وہی جس سے کل ہنس ہنس کر باتیں کی جا رہی تھیں ۔ وہی ایشری جس نے تمہارے دل میں یہ وہم ڈال دیا ہے کہ تمہاری توند نہ نکلتی تو ہزاروں میں ایک گبرو جوان نظر آتے اور جس کا دل موہنے کے لئے تم نے یہ الٹی سیدھی کسرتیں شروع کر رکھی ہیں ۔ اس بڑھیا کی عمر ۵۰ سال سے اوپر ہو رہی ہے اور ابھی تک اپنے آپ کو اٹھارہ سال کی چھوکری ظاہر کرتی ہے۔

کشوری ۔ اجی میں کیا جانوں ایشری کون ہے ــــ تم تو خواہ مخواہ بک جھک کر رہی ہو۔

لچھمی ۔ اب جھوٹ بولنے سے فائدہ ــــ جب تمہیں خیال ہوتا ہے کہ میں سو گئی ہوں تم آئینے کے سامنے جا کر

ورزش کرنی شروع کر دیتے ہو۔ اگر یہ سب کچھ ایشری کی خاطر نہیں ہو رہا تو اور کس کے لئے ہو رہا ہے

کشوری (طیش میں آکر) میں کہتا ہوں بھاگ جاؤ۔۔۔ دفان ہو جاؤ یہاں سے

لچھمی ۔ بہت اچھا۔ میں تو صرف یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ نقصان اٹھاؤ گے اس کلموہی کے ہاتھوں۔۔۔ اُسے منہ مت لگاؤ۔ وہ تمہیں بھی احمق بنا رہی ہے اور اُس بڈھے کو بھی۔ جسے پاس کھڑا ہاتھی بھی دکھائی نہیں دیتا۔

کشوری ۔ اچھا بھئی اب جاؤ۔ پھر کہو گی گھر کا کام نہیں کیا۔

لچھمی ۔ اور میں تو کہتی ہوں۔ بھگوان کرے میرے واپس آنے تک دیواریں ہی سلامت رہیں۔

لچھمی باہر نکل جاتی ہے۔ کشوری دروازے کے سامنے آجاتا ہے اور اسے جاتے ہوئے دیکھتا ہے

کشوری (خفا ہو کر) ہونھ۔ چارہ کاٹنے گی یہ۔ قدر عافیت معلوم ہو جائے گی ابھی۔

[دروازہ بند کر دیتا ہے۔ گھنٹہ گھر کے گھڑیال میں پانچ بجنے کی آواز آتی ہے۔ کشوری مڑ جاتا ہے۔ الارم ٹائم پیس کی طرف دیکھتا ہے۔ ٹائم پیس ٹھیر گیا ہے۔ اٹھ کر کان کے پاس لے جاتا ہے اور پھر چابی دینی شروع کر دیتا ہے۔ ایک جگہ چابی اٹکتی ہے سارا زور دے کر گھماتا ہے۔ ٹائم پیس کے اندر سے بھررررر کی آواز آتی ہے۔ جیسے کوئی سپرنگ ٹوٹ گیا ہو۔ ٹائم پیس کو میز پر رکھ کر کچھ دیر سوچتا ہے۔ پھر ٹائم پیس کو پچھلی طرف سے کھولتا ہے۔ ایک ٹوٹا ہوا سپرنگ باہر نکل پڑتا ہے۔ وہ جلدی سے اُسے پھر وہیں رکھ دیتا ہے اور ٹائم پیس کو اس کی پہلی ہی جگہ پر ٹکا دیتا ہے

کشوری (آہستہ سے) لچھمی نہ آجائے کم بخت کہیں۔

گراموفون پر نظر جاتی ہے۔ کچھ دیر سوچتا رہتا ہے۔ پھر الماری میں سے ایک ریکارڈ نکال کر گراموفون پر لگا دیتا ہے۔ قمیص کے گلے کے بٹن کھول دیتا ہے۔ سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے۔ توند پر ہاتھ پھیرتا ہے اور اسے زور لگا کر اندر کی جانب کھینچتا ہے اور پھر گراموفون چلا دیتا ہے۔ کمرے کے وسط میں جا کر پیٹھ کے بل فرش پر لیٹ جاتا ہے کشوری گراموفون کی ہدایتوں کے مطابق بھدے پن سے ورزش کرنے کی کوشش کرتا ہے]

گراموفون ۔ پیٹھ کے بل لیٹ جاؤ۔ ہاتھ گردن کے نیچے رکھو۔ پاؤں جوڑ لو۔ تیار۔ دہنا گھٹنا موڑ لو اور کمر کے پاس لاؤ۔ شروع ۔۔۔ کرو۔

یا تو کشوری سست ہے۔ یا گراموفون کا ریکارڈ چل رہا ہے۔ بہرحال کشوری ہدایتوں کے ساتھ ساتھ نہیں چل پاتا۔ کشوری اپنی رفتار تیز کر دیتا ہے اور گراموفون کا ساتھ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن پھر بڑبڑا جاتا ہے۔ ہانپنے لگتا ہے اور پیچھے رہ جاتا ہے۔

اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور گراموفون کے ہنڈی لیور کو slow کی طرف کھسکا دیتا ہے

کشوری۔ ہوں۔ بہت تیز چلتا ہے۔ بہت تیز ہے۔

[گراموفون چلا دیتا ہے۔ دوڑ کر پھر کمرے کے وسط میں پہنچتا ہے اور پیٹھ کے بل لیٹ جاتا ہے۔ ورزش شروع ہوتی ہے۔ لیکن اب کے گراموفون بہت سست ہو گیا ہے۔ اس لئے کشوری اب بھی اُس کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتا۔

دروازہ کھلتا ہے۔ نین سکھ داخل ہوتا ہے۔ اس کے کندھے سے ایک طنبورہ لٹک رہا ہے اور آنکھوں پر ایک بہت بڑے فریم اور موٹے موٹے شیشوں والا چشمہ بہار دے رہا ہے۔]

نین سکھ (گنگناتا ہوا) ہر روز حسینوں کا دیدار نہیں ہوتا — ہر روز حسینوں کا — ارے یہ کیا کر رہے ہو تم؟

کشوری۔ اندھے ہو؟ نظر نہیں آتا تمہیں؟ چشمہ اتار کر دیکھو۔ جسم بنا رہا ہوں اپنا جسم —!

نین سکھ۔ لیکن میرے بھائی گراموفون بہت آہستہ چل رہا ہے۔ تم اسی لئے تو ٹھیک طرح کر نہیں رہے ہو۔

کشوری۔ اوہو — تو انڈی کیٹر اپنی جگہ سے ہل گیا ہوگا۔ تم ذرا اسے MEDIUM پر کر دو۔ اس کے بعد آؤ دونوں مل کر ورزش کریں گے۔

نین سکھ۔ اور بھئی۔ کل ہمیں سکوں کے جلسے میں کوئی گانا بھی تو گانا ہے۔ تیار کر لیا تم نے؟

کشوری۔ ابھی پانچ منٹ ٹھہرو۔ یہ کسرت کر لیں۔ پھر اکٹھے تیاری کر لیں گے

نین سکھ۔ لیکن بھیا۔ میں نے تو کبھی گراموفون کے ساتھ ورزش کی نہیں۔ میں تو کر نہیں سکوں گا شاید۔

کشوری۔ تم تو بیوقوف ہو رہے ہو۔ گراموفون کے ساتھ ورزش کرنا تو آسان ہے۔ ورنہ تم میری طرف دیکھ دیکھ کر کئے جانا۔ جیسے جیسے میں ہاتھ پاؤں ہلاؤں اور رگوں پٹھوں کو جنبش دوں۔ تم بھی ساتھ ساتھ کئے جانا۔

[نین سکھ بادلِ ناخواستہ آمادہ ہو جاتا ہے۔ طنبورہ ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ پھر گراموفون کے پاس جاتا ہے اور پھر ناک انڈی کیٹر کے بالکل قریب لے جا کر اُسے تیز FAST پر کر دیتا ہے۔]

کشوری۔ اصل میں ورزش ٹھیک طرح کرنے کے لئے تمہیں نیکر پہننی چاہئے تھی۔ لیکن خیر — اچھا اب گراموفون کے ساتھ ساتھ چلنا۔ ورنہ سارا مزا کرکرا کر دو گے۔ گراموفون چلا دو اور خود میرے برابر آ جاؤ۔

[نین سکھ گراموفون چلا دیتا ہے۔ پھر بھاگ کر آتا ہے اور کشوری کے بالمقابل پیٹھ کے بل لیٹ جاتا ہے۔ اس طرح کہ دونوں کے پاؤں کے تلوؤں کے درمیان چند انچ سے زیادہ فاصلہ نہیں رہتا]

گراموفون (رفتار بڑی تیز ہے) پیٹھ کے بل لیٹ جاؤ۔ ہاتھ گردن کے نیچے رکھو۔ پاؤں جوڑ لو۔ تیار۔ دہنا گھٹنا موڑ لو اور کمر کے پاس لے آؤ۔ شرو — ع — کرو!

[چونکہ گراموفون کی رفتار تیز ہے۔ اس لئے انہیں بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ کشوری

تھک کر ٹھہر جاتا ہے۔ نین سکھ ورزش جاری رکھتا ہے]

کشوری۔ اے۔ اے۔ ارے او۔ ٹھہرو بھی۔ ایک منٹ شانتی کرو میرے بھائی۔ یہ کیا کر دیا گراموفون کو تم نے۔

نین سکھ۔ کچھ بھی نہیں۔ میں نے تو کچھ نہیں کیا۔

کشوری۔ پھر یہ اتنا تیز کیوں چل رہا ہے۔ میں تو ہلکان ہی ہو گیا۔ تم نے انڈی کیٹر کو FAST پر تو نہیں کر دیا (گراموفون کے پاس جا کر انڈی کیٹر کو ٹھیک کرتا ہے) ہم ورزش کر رہے ہیں۔ کوئی مصیبت نہیں آ پڑی ہم پر۔

[وہ پھر آ کر زمین پر لیٹ جاتا ہے۔ گراموفون چلنے لگتا ہے اور دونوں ورزش شروع کر دیتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں کشوری کی حرکات سست پڑ جاتی ہیں اور وہ جھنجھلا کر اپنا غصہ نین سکھ پر اتارنے کی کوشش کرتا ہے]

کشوری (ورزش جاری رکھتا ہے لیکن بے تال) ارے میاں گراموفون کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کرو۔ دَہ، دَا دَدا — دَہ دا۔ دُدَا۔ اس طرح۔ دَہ دا دُدا — اِدھر دیکھو۔ میری طرف دَہ دا دَدا —

[ہانپنے لگتا ہے۔ پھر ٹھہر جاتا ہے اور نین سکھ پر برسنے لگتا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ خود تھک گیا ہے اور سستانا چاہتا ہے

کشوری (بڑی متانت سے) نین سکھ! دیکھو میاں۔ تم اپنے بے ڈھنگے پن سے سارا کھیل خراب کئے دیتے ہو اپنے بازو اور ٹانگیں ڈھیلے ڈھالے کیوں رکھتے ہو۔ جیسے ان میں جان ہی نہ ہو۔ پٹھوں کو ذرا اکڑائے رکھو۔ سمجھے — ہاں — اب شروع کرو۔

[وہ پھر شروع کرتے ہیں۔ کشوری پھر پیچھے رہ جاتا ہے اور بے طرح ہانپنے لگتا ہے نین سکھ بڑی اچھی طرح گراموفون کے ساتھ ساتھ ورزش جاری رکھتا ہے]

کشوری۔ ارے میں کہتا ہوں۔ تم اتنی تیزی سے کام کیوں لیتے ہو۔ ذرا آہستہ چلو۔

نین سکھ۔ نہیں تو۔ میں تیز تو نہیں ہوں۔ گراموفون کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں۔

کشوری۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم گراموفون کے ساتھ ساتھ چلو تو میرے ساتھ ساتھ نہ رہو پھر؟ — پتہ نہیں کیا نقص ہے تم میں۔ تم کبھی مجھ سے پیچھے رہتے ہو اور کبھی آگے ہو جاتے ہو۔

نین سکھ۔ میں تو گراموفون کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں۔ البتہ تم چُوک جاتے ہو۔

کشوری (غصے میں آ جاتا ہے) ہُوں — میں چوکتا اس لئے ہوں کہ تم نئے آدمی ٹھہرے۔ مجھے تمہیں ساتھ لینا پڑتا ہے۔ لیکن بیکار تم نہیں سیکھ سکتے۔

نین سکھ۔ لیکن میں اپنی طرف سے تو ٹھیک ہی ہوں۔ کیا نقص ہے آخر؟

کشوری۔ ہوں۔ کیا نقص ہے آخر۔ تمہاری حرکات دیکھ کر تو رونا آتا ہے (اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ نین سکھ ورزش بدستور جاری رکھتا ہے) او میاں! تمہارے ہاتھ پاؤں میں موچ آ جائے گی کہیں۔ عمر بھر کے لئے ردی ہو جاؤ گے۔ اِدھر آؤ۔ اب ذرا گانے کی مشق ہو جائے (نین سکھ ورزش اب بھی جاری رکھتا

ہے) میں کہتا ہوں اِدھر آؤ۔ بہت ہولی کسرت۔

[نین سکھ بادلِ ناخواستہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ کشوری جاکر گراموفون بند کر دیتا ہے]

نین سکھ۔ میں بھلی چنگی ورزش کر رہا تھا۔ تم نے خواہ مخواہ آکر ٹانگ اڑا دی۔

کشوری (حقارت سے) تم مجھ سے بھولے ہوئے نہیں ہو۔ بڑے آئے پہلوان کہیں کے

(دونو طنبورے اٹھا لیتے ہیں اور پاس پاس بیٹھ جاتے ہیں)

کشوری۔ اچھا تو اب تمہی شروع کرو۔

نین سکھ (گلا صاف کرتے ہوئے) کون سا شروع کروں؟

کشوری۔ وہی۔ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

نین سکھ۔ اچھا (کھنکارتے ہوئے)۔ عشق میں اپنا جی نہ تیاگ عشق نہیں ہے آگ ہے آگ
کس کی لگاوٹ کس کی لاگ

کشوری۔ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

نین سکھ۔ حسن کے گن کیا گاتا ہے حسن تب اہی لاتا ہے
حسن گلے کٹواتا ہے

کشوری۔ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

نین سکھ۔ حسن کے ارماں ٹھیک نہیں جی کا نقصاں ٹھیک نہیں
ٹھیک نہیں ہاں ٹھیک نہیں

کشوری۔ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

نین سکھ حسن کا دم کیوں بھرتا ہے خونِ دل کیوں کرتا ہے
جیتے جی کیوں مرتا ہے

کشوری۔ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

نین سکھ حسن سے دھوکا کھائے گا رنج و اذیت پائے گا
دیکھ بہت پچھتائے گا

کشوری۔ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

نین سکھ حسن کو پہلے زر دے گا بعد ازاں پھر گھر دے گا
آخر آخر سر دے گا

کشوری۔ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

نین سکھ ہجر کا غم بھی قاتل ہے وصل کا سم بھی قاتل ہے

کشوری۔ کم سے کم بھی قاتل ہے
بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

نین سُکھ۔ حسن کا ہو کر کیا لے گا سر سے پا تک کھا لے گا
بھاگ نہیں تو آ لے گا

کشوری۔ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

[گانا ختم ہو جاتا ہے۔ کشوری اپنے کان اُونچے کر لیتا ہے اور کچھ سننے کی کوشش کرتا ہے۔ دُور سے چارہ کاٹنے کی مشین چلنے کی آواز آتی ہے]

نین سکھ۔ اس گیت کو ایک بار پھر نہ دہرالیں

کشوری۔ شُش ۔ سُنتے نہیں ہو؟ (گھنٹہ گھر چھ بجاتا ہے) اوہو۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ مجھے تو کام بھی کرنا ہے۔

نین سُکھ۔ کیا کام کرنا ہے؟

کشوری۔ یہی ۔ گھر کا کام ۔ اگر لچھمی کے آنے تک میں نے گھر کا کام ختم نہ کیا۔ تو بس ۔

نین سکھ۔ گھبراؤ نہیں ۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا رفتہ رفتہ۔

کشوری۔ گھبراؤں نہیں۔ اور وقت جو اڑا جا رہا ہے۔ اگر میں چبوترے پر چڑھ کر سورج سے کہوں۔ سورج بھگوان ذرا میرے لئے رُک جائیے تو کیا سورج رُک جائے گا

نین سُکھ۔ میں جانتا ہوں نہیں رکے گا۔ لیکن اگر تم نے گھبراہٹ میں ادھر ادھر دوڑنا شروع کیا تو کام کیسے ہو جائیگا

کشوری۔ بس یہی تو تمہیں معلوم نہیں ہے۔ کوئی کام جلدی کرنے کی کوشش نہ کریں تو جلدی ہو کیسے جائیگا اب اگر تم زمین پر لیٹ کر الٹی سیدھی لاتیں چلانا شروع کر دو تو کام کیسے ہو سکتا ہے اور پھر جب تم طنبورہ لے کر بے معنی راگ الاپنے شروع کر دو تو کون کر سکتا ہے کام؟

نین سُکھ۔ ورزش کرنے کو بھی متی نے مجھ سے کہا تھا اور گانے کے لئے بھی ۔ ورنہ میں تو ۔

کشوری۔ ہوں ۔ میں نے کہا تھا تمہیں ۔ نین سُکھ۔ تم اتنا جھوٹ کیوں بولنے لگے ہو۔ کیا تم خود طنبورہ کندھے پر لٹکائے نہیں آئے۔

نین سکھ۔ ٹھیک ہے لیکن ۔

کشوری۔ اور پھر گلا پھاڑ کر گاتے رہے۔

نین سکھ ۔ بے شک ۔ مگر ۔

کشوری۔ اور جس وقت تم آئے ہو۔ میں کسرت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

نین سُکھ۔ میں جانتا ہوں۔ لیکن ۔

کشوری ۔ اور پھر تم بھی زمین پر لیٹ کر میری نقل اڑانے کی کوشش کرنے لگے

نین سُکھ۔ ایک منٹ ٹھہرو ۔

کشوری ۔ نا،با،با! مجھ میں بحث کرنے کی ہمت نہیں ۔ مجھے کام بھی کرنا ہے کچھ ۔ تم میرا ہاتھ بٹا سکتے ہو تو ٹھہرو۔ ورنہ اپنا راستہ لو۔

نین سکھ۔ بھئی میں مدد کرتا ہوں تمہاری ـــ مجھے کوئی کام تو بتاؤ
کشوری (ٹائم پیس کی طرف دیکھتے ہوئے) اوہو۔ گھڑی ٹھیر گئی ہے کیا؟
نین سکھ (اٹھاکر کان کے پاس لاتا ہے) یہ ٹک ٹک تو کرتی نہیں ہے۔ اور ہے بھی گھنٹوں پیچھے
کشوری۔ ہوں۔ سب بھی کی لاپرواہی کے کرشمے ہیں۔ اچھا اب اسے ذرا چابی دے دو اور سوئیاں ساڑھے چھ پر کر دو۔

نین سکھ چابی دینی شروع کرتا ہے۔ کشوری میز کے پاس جاکر برتن دھونے شروع کرتا ہے اور گنگناتا ہے ـــ تمہی نے درد دیا ہے تمہی دوا دینا ـــ نین سکھ چابی دیتا ہے۔ لیکن چابی خالی گھومتی رہتی ہے۔ نین سکھ کی سمجھ میں کچھ معاملہ نہیں آتا۔ وہ پھر چابی دیتا ہے۔ اور ٹائم پیس کو واپس میز پر رکھنے لگتا ہے۔ کشوری مڑکر اس کی طرف دیکھتا ہے

کشوری۔ توڑ دیا نہ آخر؟
نین سکھ۔ میں نے تو ہاتھ بھی نہیں لگایا گھڑی کو۔
کشوری۔ ہوں۔ ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ جیسے میں اندھا ہوں۔ گھنٹہ بھر پہلوانوں کی طرح کشتی لڑتے رہے ہو اور اب کہتے ہو۔ چھوا تک نہیں (نین سکھ کے پاس جاکر) دکھاؤ مجھے (نین سکھ کے ہاتھ سے گھڑی لیکر پچھلی طرف سے کھولتا ہے۔ اسپرنگ باہر آکر گرتا ہے) دیکھ لو اپنی کرتوت۔ ابھی کہہ رہے تھے۔ میں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ خدا کے لئے ہمارے گھر پر رحم کیا کرو۔ بڑی قیمتی چیز تھی یہ۔ چچ چچ چچ (اسپرنگ کو پھر اندر دھکیل دیتا ہے اور گھڑی کو آہستہ سے میز پر رکھ دیتا ہے) تمہارے ہاتھ کسی دیو کے ہاتھ ہیں ادھر آؤ۔ میں برتن دھو رہا ہوں۔ تم صافی لے کر انہیں پونچھتے رہو۔

[دونو برتن دھونے لگتے ہیں۔ کشوری نین سکھ کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ نین سکھ کی نظر بہت کمزور ہے۔ اس لئے بے چارہ برتن بالکل عینک کے پاس لے جاکر صاف کرتا ہے]

کشوری (لیکا یک) دیکھو۔ دھیان سے کام کرو۔ پیالی کو ٹھیک سے میز پر رکھو۔ گر جائے گی تو نقصان ہوگا خواہ مخواہ کا
نین سکھ۔ نہیں تو۔ گھبراؤ نہیں۔ گرتی نہیں۔
کشوری (گنگناتا ہے) ہر روز حسینوں کا دیدار نہیں ہوتا
نین سکھ (جھک کر اور ایک ہاتھ بلند کرکے) یہ طور کا جلوہ ہے جو ہر بار نہیں ہوتا
کشوری۔ شاباش۔ بہت خوب (لہک کر) ہر روز حسینوں کا ـــ اجی ہر روز حسینوں کا دیدار نہیں ہوتا
نین سکھ (چکر کاٹتے ہوئے) یہ طور کا جلوہ ہے ہر بار نہیں ہوتا۔

(اس کے ہاتھ سے پیالی گرتی ہے اور چکنا چور ہو جاتی ہے)

کشوری (غضبناک ہوکر) اندھے! بدمعاش!! کہیں پی تو نہیں رکھی تم نے۔ میں کہتا ہوں۔ تم انسان ہو کہ حیوان
نین سکھ (عذر گناہ کرتے ہوئے) اتنی سی تو پیالی تھی۔ کیا ہوا ٹوٹ گئی تو۔
کشوری (گرم ہوکر) کیا ہوا ٹوٹ گئی تو۔ اب اگر میں سر پھوڑ دوں بچپتی کا۔ ادھر بیٹھ جاؤ ایک کونے میں

آرام سے۔ میں خود کروں گا جو کرنا ہوگا مجھے۔ میرے بس کی بات ہو تو تمہیں زنجیر باندھ کر رکھا کروں۔ اچھا اب
خدا کے لئے کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا۔ میں کھپا کر چارہ دے دُوں۔

[کشوری آگ کی طرف بھاگ کر جاتا ہے اور کینلی اتار کر رکھ دیتا ہے۔ پھر دروازہ کھلا
چھوڑ کر باہر نکل جاتا ہے۔ نین سکھ ایک کونے میں سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر
کے بعد بھدے سے ایک آواز آتی ہے اور اس کے ساتھ کشوری کی چیخ سُنائی دیتی ہے۔ لمحہ
بھر بعد کشوری بھاگا ہوا آتا ہے۔ ناک پر رومال رکھا ہے جو خون سے بھر رہا ہے۔ وہ
آکر زمین پر چت لیٹ جاتا ہے اور ناک کو رومال سے زور زور سے دباتا ہے]

کشوری (کراہتے ہوئے) بھاگ کے کوئی ٹھنڈی چیز لاؤ۔ فوراً۔

نین سکھ۔ بھگوان کے لئے کچھ بتاؤ تو سہی تمہیں ہو کیا گیا ہے

کشوری۔ ہائے رے۔ میں جلدی میں باہر کے دروازے کی طرف جو لپکا۔ چوکھٹ سے ٹکرا گیا۔ ہائے۔ ہائے۔
اب کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ بھاگ کے کوئی ٹھنڈی چیز لاؤ۔ کسی طرح یہ خون تو بند ہو۔

نین سکھ۔ اب تم اپنی جلد بازی کی سزا بھگتو۔ میں ٹھنڈی چیز کہاں سے لاؤں؟ میں نے تم سے پہلے نہیں
کہہ دیا تھا کہ یوں بھگدڑ مچانے سے کام نہیں بنے گا۔

کشوری۔ (بھگدڑ کا نام سُن کر تیوری چڑھا لیتا ہے) ارے بھلے مانس۔ ہوش کی دوا کرو۔ میں درد سے مرا جا رہا ہوں
اور تمہیں چہلیں سوجھ رہی ہیں۔

نین سکھ۔ اچھا تو برف کا ٹکڑا چاہئے ہے تمہیں؟

کشوری۔ ہاں بس تھوڑی سی برف چاہئے۔ لیکن یہ بتاؤ۔ برف لاؤ گے کہاں سے؟ اور لے بھی آئے۔ تو
میری گُدّی پر باندھو گے کس طرح۔ اب بولو بھی۔ کہاں سے لاؤ گے برف؟

نین سکھ۔ اب میں کیا جانوں کہاں سے ملے گی برف۔

کشوری۔ تو اب تمہارا خیال ہے۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی طرح لیٹا رہوں ---

[اس مکالمت کے دوران میں نین سکھ کمرے میں ادھر ادھر چکر کاٹتا ہے۔ میز کی درازوں
میں جھانکتا ہے۔ میز پر جو برتن پڑے ہیں۔ ان کے پاس ناک لے جا کر دیکھتا ہے جیسے
وہاں برف چھپا رکھی ہو کسی نے۔ برتن کھڑکنے کی آواز آتی ہے]

کشوری۔ ارے او میاں! کیا کر رہے ہو اُدھر۔ پھر توڑ دو گے کچھ --- میں یہاں لہو لہان ہو رہا ہوں اور
تم اُدھر مزے سے گھوم رہے ہو۔ کیا تمہیں کوئی ٹھنڈی چیز نہیں مل رہی؟

نین سکھ۔ مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔

کشوری۔ اچھا۔ بھاگ کے اوپر جاؤ۔ اور اس بڑے کمرے کی چابی لاؤ۔ کمرے کے پرے سرے پر جو انگیٹھی ہے
اس پر پڑی ہوگی۔

[نین سکھ گرتا پڑتا اوپر جاتا ہے اور پھر جلد ہی واپس آجاتا ہے]

کشوری۔ کیوں کیا ہوا۔ ـــ لے آئے؟

نین سکھ۔ بجلی کا بٹن کہاں ہے۔ وہاں تو گھُپ اندھیرا ہے

[کشوری جلا کر اُٹھ بیٹھتا ہے۔ لیکن درد کی شدت سے مجبور ہوکر پھر زمین پر لیٹ جاتا ہے]

کشوری۔ ہائے بیٹھا بھی نہیں جاتا (نین سکھ سے) وہاں کوئی بٹن نہیں ہے۔ اب ہم تمہاری آسانی کے لئے کمرے میں چپے چپے پر تو بٹن لگانے سے رہے۔ تمہیں بتا دیا نا۔ کمرے کے پرلے کونے میں انگیٹھی ہے۔ اگر تم انگلیوں سے دیوار کے ساتھ ساتھ ٹٹولو تو اس پر چابی تمہیں مل جائے گی۔

[نین سکھ پھر اُوپر چلا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد برتنوں کے گرنے اور ٹوٹنے کی آواز آتی ہے
کشوری ہمت کر کے اُٹھتا ہے۔ لیکن درد بہت شدید ہے۔ اس لئے بچارا پھر لیٹ
جاتا ہے]

کشوری۔ ارے اب کے کیا کر دیا تم نے اندھے! (بآوازِ بلند) ابے نین سکھ یہ کیا کر رہے ہو۔ کیا توڑ دیا تم نے۔

نین سکھ (اوپر سے) کچھ نہیں ـــ ایک لوٹا گر گیا تھا۔

کشوری (غصّے میں) ہوں ـ کچھ نہیں ـــ اور اتنا شور کاہے کا ہوا ہے؟ تمہیں تو زنجیر باندھ کے نہ رکھا جائے تو گھر بھر کا ستیاناس کر دو۔ اُتر آؤ نیچے۔ ورنہ آج ہمارے گھر کی خیر نہیں۔

نین سکھ۔ (اوپر سے) اب کچھ کچھ آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہونے لگی ہیں۔ اب کچھ نظر آنے لگا ہے۔ اب میں ڈھونڈ لوں گا چابی۔

[وہ پھر کمرے میں چلا جاتا ہے اور کشوری بے حس و حرکت بیٹھا رہتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد
وہ ہائے ہائے کرتا ہوا اور غصّے میں جلا بھنا باہر نکلتا ہے۔ ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے
ہاتھ کی مٹھی میں دبائے ہوئے ہے۔ سیڑھیوں پر سے بھاگا بھاگا نیچے آتا ہے اور الماری
میں سے کپڑے نکال نکال کر پھینکنے شروع کر دیتا ہے۔ پھر ہاتھوں کو دونوں گھٹنوں میں
بھینچ کر بیٹھ جاتا ہے]

نین سکھ (دیوانگی کے عالم میں) ڈھونڈو اپنی چابی جا کے۔ ڈھونڈ لو خود ہی۔ میں نے تو تمہاری خاطر اپنا ہاتھ بھی زخمی کر لیا۔ تم استرے کے بلیڈ کہیں سنبھال کے کیوں نہیں رکھتے۔ انگیٹھی پر کیوں ان کا ڈھیر لگا دیتے ہو۔ اب یہاں کوئی چیتھڑا بھی تو نظر نہیں آتا۔ جس سے کوئی اپنا ہاتھ ہی باندھ لے۔ جاؤ خود ہی تلاش کر لو اپنی چابی ـــ کہہ دیا میں نے۔

کشوری۔ ارے گدھے کہیں کے۔ تم میری حالت نہیں دیکھتے۔ میں کیا یہاں آرام سے بیٹھا ہوں ـــ ہائے۔

نین سکھ تمہیں معلوم ہونا چاہئے۔ میری انگلیاں علیحدہ ہوتے ہوتے بچی ہیں ہاتھوں سے (زخمی انگلیوں کو اس کی آنکھوں کے سامنے پھیلا دیتا ہے) دیکھو آنکھیں کھول کر دیکھو۔ ذرا سا تسمہ لگا رہ گیا ہے ورنہ ـــ ہائے رے ـــ اب میں طنبورہ کیسے بجایا کروں گا؟

کشوری۔ اگر تمہاری ساری انگلیاں جڑ بنیاد سے غائب ہو جاتیں۔ جب اچھا تھا۔ پھر تم خوب مزے میں طنبورہ بجاتے

نین سکھ (اپنی زخمی انگلیوں کو اس کی آنکھوں کے سامنے معلق رکھتا ہے۔ پھر دوسرے ہاتھ سے ایک میلا کچیلا رومال نکال کر) یہ لو اور اسے کس کر زخموں پر باندھ دو۔

کشوری۔ تم تو خواہ مخواہ ان خراشوں کو زخموں کا نام دے رہے ہو۔ کیا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے تم پر آخر — ؟

(کشوری رومال لے کر نین سکھ کا ہاتھ باندھ دیتا ہے)

نین سکھ۔ اچھا اب بتاؤ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔

کشوری۔ چلو اتنا تو اچھا ہوا کہ تم اب ہمارے گھر کی چیزیں پہلے کی نسبت کم توڑو گے —

(وقفہ)

کشوری۔ نین سکھ ؛ ذرا بھاگ کے جائیو۔ بچھیا کی خبر لیجیو۔ باہر بندھی ہوئی ہے

[نین سکھ دروازے کے باہر جاتا ہے۔ گھنٹہ گھر کی گھڑی سات بجاتی ہے۔ باہر سے آواز دیتا ہے]

نین سکھ۔ بھئی اب تک بچھی نے تو سارا چارہ کاٹ لیا ہوگا اور تم نے ابھی کچھ بھی نہیں کیا۔

کشوری۔ جب تک خون بند نہ ہو۔ میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔

نین سکھ۔ اور اپنی بھاگ دوڑ میں تم نے فرش پر جو بے شمار چیزیں گرا دی ہیں۔ انہیں بھی تو سنبھالو۔

کشوری (کراہتے ہوئے) کیا تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ ایک جھاڑو لے کر انہیں ایک کونے میں اکٹھی کر دو۔ تم بھی تو انہیں پاؤں میں روند رہے ہو۔ میرا تو جو حال ہے تم دیکھ ہی رہے ہو۔

[نین سکھ جھاڑو لے کر دروازے کے باہر جھاڑو دینا شروع کر دیتا ہے]

نین سکھ (کشوری سے) اب کیسی حالت ہے ؟

کشوری (اٹھتے ہوئے) خون تو بند ہو گیا ہے۔ البتہ ذرا احتیاط رکھنی پڑے گی۔

[نین سکھ جھاڑو دیتے ہوئے اس کے دستے سے کھڑکی میں جالے صاف کرنے لگتا ہے اور ایک شیشہ توڑ دیتا ہے۔ ایک لمحہ کا وقفہ]

نین سکھ (خود بخود جیسے کچھ جانتا ہی نہ ہو) کیا ہوا ؟

کشوری (طنزاً) کیا ہوا۔ کیا ہوا — اندھے ہو رہے ہو تم ؟ دیکھتے نہیں ہو کہ جھاڑو کے دستے سے شیشہ توڑ دیا ہے تم نے۔

نین سکھ (سوراخ میں سے باہر جھانکتے ہوئے) اچھا! عجیب بات ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ جھاڑو کا دستہ کھڑکی سے چھوا بھی نہیں۔ البتہ دروازے میں سوراخ ضرور ہے اور سوراخ بھی کافی بڑا ہے۔

کشوری۔ ہاں ٹھیک ہے۔ تمہیں کاہے کو خیال ہوگا۔ خدا کی قسم۔ تم ہمارے گھر کو تباہ کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو۔

نین سکھ۔ خیر اب تو جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب ہم اسے جوڑ تو سکتے نہیں۔

کشوری (جھلاہٹ سے) او بھئی۔ ادھر آ جاؤ۔ ادھر آ جاؤ۔ ادھر آ بیٹھو۔ سنتے نہیں ہو۔ سات بج گئے ہیں اور مجھے کچھ کام بھی کرنا ہے

(وہ غصے میں اٹھتا ہے۔ ہاتھ اب تک ناک پر رکھے ہوئے ہے)

نین سکھ۔ (ایک اور کام سمجھاتے ہوئے) کیا اور کوئی کام کرنے سے پہلے یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم بچھیا کو لاکر اندر تھان پر باندھ دو۔

کشوری (غضب ناک ہوکر) اور بچھیا کو اندر تھان پر باندھنے سے پہلے تھان کون صاف کرے گا۔ تم نے تو بس بڑے سے کسرت کر لی اور گانا گا لیا۔ اب کام کس طرح ہوتا۔ میں تو تمہاری وجہ سے کسی کام کو بھی ہاتھ نہیں لگا سکا تم جاکر اُسے ذرا چرنے کے لئے چھوڑ دو۔ پھر باندھ لیں گے۔

نین سکھ۔ فرض کرو۔ وہ نہر کے کنارے چلی جاتی ہے اور اس میں گر جاتی ہے۔

کشوری۔ اب تمہیں بتاؤ میرے پاس اس کا کیا علاج ہے۔

نین سکھ۔ اسے کسی چیز سے باندھا نہیں جا سکتا۔

کشوری (غصے میں) کہاں باندھیں اسے؟

نین سکھ۔ کیا یہ ٹھیک نہ رہے گا کہ ایک لمبی سی رسی لے کر روشن دان میں سے گزار کر کمرے کے اندر کسی چیز سے باندھ دیں۔

کشوری (کچھ دیر سوچنے کے بعد) تجویز تو معقول ہے۔ باہر ایک لمبی رسی موجود ہے۔ میں اسے بچھیا کے گلے سے باندھ کر دوسرا سرا روشندان کے راستے اندر داخل کر دیتا ہوں اور تم اسے کرسی سے باندھ دینا۔

[کشوری بھاگ کر باہر جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد باہر سے اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ "لینا۔ پکڑنا رسی کو"۔ نین سکھ اندر سے آواز دیتا ہے: "ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ آنے دو۔ رسی نیچے آتی ہے۔ نین سکھ رسی کا سرا پکڑ کر کھینچ لیتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد کشوری بھی آجاتا ہے اور دونوں رسی کو کرسی سے باندھ دیتے ہیں]

نین سکھ۔ کرسی کو کمرے کے پرلے کونے میں رکھ دو۔ اگر بچھیا دور جانے لگی تو کرسی کے کھسکنے سے ہمیں پتہ چل جائے گا۔

کشوری۔ اب کام کرنا شروع کیا ہے تم نے ــــ یہ تو کوئی بات ہوئی نا؟ (کرسی کو کمرے کے آخری کونے میں لے جاتا ہے) اب کام ہوگا اور دیکھتے رہنا چھی کے آنے سے پہلے پہلے ختم ہو جائے گا۔ اچھا اب بتی جلالیں۔ روشنی کم ہو رہی ہے۔

(بجلی کا بٹن دباتا ہے۔ لیکن بلب روشن نہیں ہوتا)

کشوری۔ چچ چچ چچ۔ میٹر پھر خراب ہو گیا ہوگا۔ (رسی کو پھلانگتا ہوا بھاگ کے ڈٹی پھوٹی چیزوں والی کوٹھڑی میں گھس جاتا ہے)

نین سکھ۔ مجھے تو میٹر وِیٹر کے بارے میں کچھ علم نہیں

کشوری (کمرے کے اندر سے) بس تم نچلے بیٹھے دیکھتے رہو۔ میں خود ہی کر لوں گا سب کچھ

[کشوری بھاگا بھاگا کمرے سے باہر آتا ہے۔ بجلی کا بٹن دباتا ہے۔ لیکن بلب

اب بھی روشن نہیں ہوتا]

کشوری۔ پھر ضرور بلب میں کوئی خرابی ہے۔ ہمارے گھر میں ایک فالتو بلب ہوا کرتا تھا۔ کافی عرصے سے دیکھ رہا ہوں (میز کی دراز کھولتا ہے) یہ رہا۔ میں نہ کہتا تھا؟

[ایک کرسی گھسیٹ کر کمرے کے وسط میں کر لیتا ہے۔ پھر اس پر کھڑا ہو کر پرانا بلب اتارتا ہے اور نین سکھ کو تھما دیتا ہے]

کشوری۔ ذرا دیکھو تو کیا خرابی ہے اس میں؟

نین سکھ (بلب کو ناک کے قریب لے جاتا ہے) مجھے تو کوئی نقص نظر نہیں آتا۔

کشوری۔ اچھا چھوڑو۔ رہنے دو۔ رکھ دو اسے۔

نین سکھ۔ تمہیں یقین ہے کہ نیا بلب جو تم نے لگا رہے ہو۔ ٹھیک طاقت کا ہے۔

کشوری (ٹھٹھک کر نین سکھ کی طرف دیکھتا ہے) ہاں ہاں۔ ٹھیک طاقت کا ہے۔ کیوں نہ ہوگا ٹھیک طاقت کا

نین سکھ۔ اگر ٹھیک طاقت کا نہ ہوا تو فیوز ہو جائے گا۔

کشوری۔ واہ۔ فیوز کیسے ہو جائے گا۔ نہیں ہوتا (نیا بلب لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ کرسی جس سے رسی بندھی ہوئی ہے۔ گھسٹنی شروع ہو جاتی ہے)

نین سکھ۔ دیکھو دیکھو۔ کیا ہو رہا ہے۔ ادھر۔ بچھیا جا رہی ہے۔

کشوری۔ پکڑو تھامو اسے۔ تھامو۔ کہیں روشندان سے نہ جا لگے کرسی۔

[نین سکھ کرسی پکڑ لیتا ہے۔ لیکن بچھیا غضب کی طاقتور ہے۔ کرسی نین سکھ سمیت گھسٹنے لگتی ہے۔ کشوری کرسی سے نیچے کود پڑتا ہے۔ بلب کو ایک طرف رکھ دیتا ہے اور کرسی کو گھسیٹ کر پہلی جگہ لانے کی کوشش کرتا ہے۔ نین سکھ مدد کرتا ہے]

کشوری۔ اچھا۔ اب تم کرسی پر جم کر بیٹھ جاؤ۔ اب بچھیا کرسی نہیں کھینچ سکے گی۔

[نین سکھ کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ کشوری پھر دوسری کرسی پر کھڑا ہو کر بلب لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کرسی پر نین سکھ بیٹھا ہے۔ وہ اس کی کوشش کے باوجود گھسٹنا شروع ہو جاتی ہے]

نین سکھ۔ کشوری! کشوری!!! اسے لینا۔ بچھیا کم بخت تو مجھے بھی کھینچے لئے جا رہی ہے۔

[کشوری پھر کرسی سے نیچے کود پڑتا ہے اور دونوں کرسی کو پھر پہلی جگہ پر لا کر رکھ دیتے ہیں]

کشوری۔ لچھمی کے واپس آنے کا وقت ہو رہا ہے اور ہم نے اس عرصے میں دیکھا تو بہت کچھ ہوگا۔ بنایا کچھ بھی نہیں

[کشوری پھر کرسی پر چڑھ کر بلب لگاتا ہے۔ ثانئے بھر کے لئے روشنی کی چمک پیدا ہوتی ہے۔ پھر پہلے سے بھی زیادہ تاریکی چھا جاتی ہے]

نین سکھ (پیغمبرانہ لہجے میں) دیکھا کشوری۔ میں نے کہا نہیں تھا۔ میں نے تو پہلے ہی جتا دیا تھا۔

کشوری ۔ کیا اول جلول بک رہے ہو۔ پہلے کیا میاں دن چڑھ رہا تھا۔ کباڑ کی کوٹھڑی میں تیل کا ایک پیپا ہو گا
اگر اس میں تیل ہوا تو ہم لیمپ تو کم از کم جلا ہی سکتے ہیں۔ وہ دیوار پہ لیمپ لٹک رہا ہے۔ اسے اتار کر ذرا جلاؤ
میں ادھر تیل دیکھتا ہوں۔

[کشوری کباڑ کوٹھڑی میں گھس جاتا ہے۔ نین سکھ دیوار سے لیمپ اتارتا ہے۔ اس کی
چمنی الگ کر کے اسے روشن کرنے کی فکر میں ہے۔ لیکن اسے نظر آتا نہیں اور بتی تو
جب جلے اگر وہ دیا سلائی کو بتی کے قریب لائے۔ کشوری کوٹھڑی سے باہر نکلتا ہے]

کشوری (خوش ہے) میرے یار تیل تو کافی ہے ۔۔ ارے میاں تم دیا سلائی بتی کے قریب تو لاؤ۔ ادھر لاؤ
مجھے دکھاؤ۔ میں دیکھوں۔

[کشوری نین سکھ کے ہاتھ سے دیا سلائی لے کر بتی روشن کر دیتا ہے]

کشوری ۔ اچھا اب دوسرا لیمپ بھی لاؤ۔ صحن کے پرلی طرف کے اصطبل میں داخل ہونے کے ہاتھ کے کسی طاق میں مل جائے گا
نین سکھ ۔ مجھے کیسے نظر آئے گا؟
کشوری ۔ ایک دیا سلائی جلا کر دیکھ لینا۔ وہ تو دور ہی سے نظر آجاتا ہے۔ ادھر میں پیپے سے تیل کا ایک ڈبہ بھر کر
لاتا ہوں۔ پھر کافی روشنی ہو جائے گی اور ہم کام کر سکیں گے۔
نین سکھ ۔ مجھے معلوم ہے۔ مجھے نظر نہیں آئے گا۔

[کشوری ٹین کا ایک ڈبہ لے کر جس میں بڑی سی ٹونٹی لگی ہوئی ہے۔ کباڑ خانے میں گھس
جاتا ہے ۔۔۔ وقفہ ۔۔۔ اس کے بعد کشوری چنگھاڑتا ہوا بھاگا بھاگا باہر آتا ہے]

کشوری ۔ نین سکھ۔ نین سکھ! بھاگ کے آؤ ذرا۔ میں نے پیپے کے سوراخ میں سے ڈاٹ نکال دیا اور وہ میرے
ہاتھ سے کہیں گر پڑا۔ اب نہ سوراخ بند ہوتا ہے۔ نہ تیل کی دھار رکتی ہے۔ اب روشنی ہوتی تو میں ڈاٹ
فوراً ڈھونڈھ نکالتا۔ بھاگ کے آؤ۔ ورنہ ابھی سارا تیل بہہ جاتا ہے۔

[وہ پھر بھاگ کر کوٹھڑی میں چلا جاتا ہے۔ ایک اور چھوٹا سا وقفہ ۔ پھر بھاگا بھاگا
باہر آتا ہے۔ دونو بازوؤں میں پیپا تھامے ہوئے ہے۔ انگوٹھا سوراخ پر رکھ دیتا ہے]

کشوری ۔ نین سکھ ۔۔ ابے نین سکھ ۔۔ مر گئے کہیں؟ میں اسے کب تک اس طرح روک سکوں گا۔ بھاگو جلدی۔
ارے کدھر مر گئے ۔۔

[باہر سے کچھ مٹکیوں۔ پیپوں اور دوسری چیزوں کے گرنے کی آواز آتی ہے ۔۔
پھر خاموشی]

کشوری ۔ ... بکو ... ارے کیا پھوڑ دیا ہے اس نے ۔۔
نین سکھ (باہر سے آواز دیتے ہوئے) کشوری۔ او کشوری۔ میں تو مر ہی چلا تھا۔ کدھر ہے دروازہ۔ مجھے تو
کچھ سوجھتا ہی نہیں۔
کشوری (بھاگ کر دروازے میں جا کھڑا ہوتا ہے) اے ادھر ہے ادھر۔ بائیں ہاتھ (نین سکھ داخل ہوتا ہے

کپڑے گرد میں اٹے ہوئے ہیں اور گھبرایا ہوا ہے) اب کے کیا توڑا ہے تم نے؟

نین سکھ (کراہتے ہوئے) ارے میں تو مر ہی گیا تھا۔ جوڑ جوڑ ہل گیا ہے۔

کشوری۔ بھگوان کے لئے حوصلہ کرو۔ جوان آدمی ہو۔ آخر مُنہ سے کچھ تو بھی کیا ہوا۔

نین سکھ (ہانپتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) لمپ سب سے اوپر والے تختے پر رکھا تھا۔ اب وہاں تک ہاتھ جاتا نہیں اور چوکی یا سیڑھی کمرے میں کوئی تھی نہیں۔ نیچے کے تختوں پر پاؤں رکھ کر چڑھا۔ اور یکایک سارے تختے اور اُن کے اوپر کا سامان جو کچھ تھا۔۔۔ دھڑ دھڑا کر اوپر آ گرے۔۔

[کشوری پیپے کو زمین پر رکھ دیتا ہے۔ سوراخ کو اب تک انگوٹھے سے دبائے ہوئے ہے]

کشوری۔ آخر تم چڑھے تختوں پر چڑھے کیوں تھے؟ کیا لینا تھا اُن پر چڑھ کر۔ اندھے کہیں کے تمہیں اتنا نظر نہ آیا کہ وہ تمہارا بوجھ سہارنے کے قابل نہیں ہیں۔ مجھے تم یہ بتاؤ۔ تم ان پر چڑھے کیوں تھے؟

نین سکھ۔ میں چاہتا تھا کام ذرا جلدی ہو جائے۔

کشوری۔ پھر وہی حماقت۔ جلد بازی کی۔ اب یہی آئے گی تو کیا کرے گی؟

نین سکھ۔ اور تختوں کے ساتھ ساتھ میرا چشمہ بھی نیچے آ رہا۔

کشوری۔ اور جب تختے گر رہے تھے تو تم نے انہیں سنبھالا کیوں نہیں:

نین سکھ۔ میں تو خود گر رہا تھا۔ تختوں کو کیسے سنبھالتا۔

کشوری (منہ چڑا کر) اچھا جانے دو اب۔ لمپ اٹھاؤ اور کوٹھڑی میں سے پیپے کا ڈاٹ ڈھونڈ کے لاؤ

نین سکھ۔ اور میرے ہاتھ سے لمپ گر کے مکان میں آگ لگ گئی تو ۔۔ ؟

کشوری۔ عجب عذاب میں ہے جان (چونک کر) ارے کرسی ۔۔ کرسی لینا ۔ بچھیا پھر چلی۔

[کرسی جس سے رسی بندھی ہے۔ کمرے میں گھسٹتی لگتی ہے۔ نین سکھ اسے پکڑ لیتا ہے لیکن اس کی مردانہ وار کوششیں بھی کرسی کو نہیں روک سکتیں]

نین سکھ (چلّاتے ہوئے) ادھر آ کے میری مدد کرو۔ ورنہ میں بھی چلا اس کے ساتھ

[کشوری پیپے کو نیچے رکھ دیتا ہے۔ بھاگ کر نین سکھ کے پاس جاتا ہے۔ رسی کو پکڑ لیتا ہے اور زیادہ احتیاط کے طور پر رسی کو کرسی کے پائے سے کھول کر اپنی کمر کے گرد باندھ لیتا ہے۔ وہ دونو سارا زور صرف کرنے پر رسی کو تھوڑا سا اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ پیپے کا سارا تیل بہ کر فرش پر پھیل جاتا ہے]

کشوری۔ مضبوطی سے تھامے رکھو۔ ورنہ ہم دونو روشندان سے جا لگیں گے۔

نین سکھ۔ ہائے رے آج میں چشمے کے بغیر گھر کیسے واپس جاؤں گا۔

کشوری۔ ارے مُورکھ۔ پہلے اس رسی کی فکر کرو۔ اس کے بعد تمہارے چشمے کے بارے میں بھی سوچ لیں گے

نین سکھ (اس کی نظر اچانک تیل کے پیپے کی طرف جاتی ہے) ارے یہ کیا؟ تیل ۔ تیل ۔

[وہ رسی کو چھوڑ دیتا ہے اور پیپے کی طرف بھاگتا ہے۔ کشوری کھٹ سے روشندان

جا نکرا تا ہے]

نین سکھ (پیپے کو اٹھا کر ہلاتا ہے) ارے اس میں تو ایک بوند بھی باقی نہیں رہی۔ ایک قطرہ بھی تو نہیں۔ اب ہم......

[پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے کہ کشوری روشندان میں پھنسا ہاتھ پاؤں مار رہا ہے اور چلا رہا ہے]

لچھمی (باہر سے چلانے کی آواز آتی ہے، ارے بچھیا — بچھیا۔

کشوری (چلاتا ہے) لچھمی! اے لچھمی!

[لچھمی بھاگ کے اندر آتی ہے۔ اُدھر کشوری بھد سے نیچے آگرتا ہے اور کپڑے جھاڑتا ہوا، کراہتا ہوا، گھٹنے سہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا ہے]

لچھمی۔ ارے بھگوان کے لئے — یہ کیا ہو گیا ہے۔

کشوری (لچھمی سے، دیکھ لیا نہ اپنی مرضی کرنے کا پھل — جب تم بچھیا کے گلے سے رسی کھولی تو اسے پکڑے کیوں نہیں رکھا، چھوڑ کیوں دیا۔ ہائے — ہائے —

لچھمی۔ مجھے کیا خواب آیا تھا کہ رسی کے دوسرے سرے سے تم لٹک رہے ہو۔

کشوری (طنزاً) ہوں۔ تمہیں کاہے کو خواب آتا تھا۔ میں کہتا ہوں۔ تمہیں کبھی کوئی کام کرنے کا سلیقہ بھی آئیگا کوئی بات کبھی ٹھیک سے کر سکو گی —

پردہ

جاوید قمر

گیت

یہ چندا، یہ جھلمل کرتے چنچل تارے سارے
سارے روپ تمہارے
تم بھی سندر یہ بھی سندر
تم من موہن پیارے
تم سب ایک لڑی کے موتی اک نگری کے باسی

تم سب دُور ہی دُور سے ہنس کر پاس بلانے والے
تم سب ایک جھلک دکھلا کر پھر چھپ جانے والے
تم سب گورے مکھڑوں والے اور من کے سب ہی کالے
تم سب من کے کالے

یہ چندا، یہ جھلمل کرتے بیکل تارے، سارے
سارے روپ ہمارے
ہم بھی بیکل، یہ بھی بیکل
ہم دکھیارے چارے
ہم سب ایک ہی نین کے نیر ہیں اک نگری کے باسی

ہم سب دکھیارین نگر میں باتیں کرنے والے
ہم سب چپکے چپکے مل کر آہیں بھرنے والے
ہم سب ساتھی، پریم پجاری اور سب ہیں متوالے
ہم سب ہیں متوالے

شاہد نصیر

غزل

بسکہ ہر بات کچھ عجیب سی ہے
آپ کی ذات کچھ عجیب سی ہے

جیسے پہلے کبھی ملے ہی نہیں
یہ ملاقات کچھ عجیب سی ہے

اب کے آنکھیں برسنا بھول گئیں
اب کے برسات کچھ عجیب سی ہے

آج کی رات آپ آئیں گے
آج کی رات کچھ عجیب سی ہے

آپ اور کھا گئے فریبِ وفا
ہاں، مگر بات کچھ عجیب سی ہے

اے خدا تیری کائنات تو کیا
خود تری ذات کچھ عجیب سی ہے

جانے کب ڈوب جائے اے شاہد
نبضِ حالات کچھ عجیب سی ہے

ممتاز مفتی

سخن گسترانہ

میں کیا جانوں کاہے منوا رہ رہ شور مچائے
جی ترپائے

میں بیٹھی تھی اپنے گھر میں
خیتل خیتل سکھ ساگر میں
دُور کہیں سے بینا باجی، پران مرے گھبرائے
راما ہائے

بینا باجے، سمجھ نہ آئے
چھتیا دھڑک دھڑک رہ جائے
من ہی من میں جیسے کوئی پنچھی اُڑتا جائے
ہاتھ نہ آئے

آؤ چندروا سے پوچھیں
تکتے نینوا سے پوچھیں
گاتی بوندیا سے پوچھیں
اُتھل پتھل کے بھیدی سارے بیٹھے بھید چھپائے
کون بتائے؟

نگر تونسوی کے اس گیت کو پڑھ کر مجھے وہ مشہور تصویر یاد آتی ہے جس میں ایک دوشیزہ کی محبت کی اوّلیں بیداری کے عالم میں پیش کیا گیا ہے۔ مصوّر نے دوشیزہ کی آنکھوں اور ہونٹوں میں اس کے دل کی مبہم مگر شدید کیفیت کو اجاگر کیا ہے۔

اس گیت میں نگر تونسوی نے بھی ایک ایسی ہی مبہم مگر اضطرابی کیفیت کی تصویر پیش کی ہے۔ دوشیزہ ایک بے نام اضطراب کی شدید رو کو ایک حادثے کی طرح بند بند میں محسوس کرتی ہے۔ پہلے تو وہ اس عجیب سی فوری تبدیلی پر حیران سی رہ جاتی ہے۔ جو ان کی آن میں چپ چاپ اس کے جسم پر اور روح پر چھا گئی ہے۔ پھر سوچنے لگتی ہے اور سوچ بچار سے تھک ہار کر بیٹھ

جاتی ہے :-

"نہ جانے کیا ہے مجھے! جانے کیا ہے! — مجھ پگلی کو کچھ پتہ بھی چلے"!

"دل میں ایک بھیڑ سی لگی ہوئی ہے۔ انگ انگ میں ایک تڑپ سی لہرا رہی ہے — نہ جانے کیوں!! کوئی خاص بات بھی تو نہیں ہوئی آج — روز کی طرح گھر میں بیٹھی تھی۔ دھندوں میں کھوئی ہوئی تھی، روز کی طرح — پھر جانے کیا ہوا دُور — نہ جانے کہاں سے بینا کی آواز آئی، ہردے کی نس نس تھرکنے لگی۔ جیسے بینا کی دھن پر تال دے رہی ہو۔ چھتیاں دھڑکنے لگیں۔ دم رکنے لگا اور جیون پنچھی سینے میں یوں تڑپنے لگا گویا نکل کر اڑ جانے کے لئے بیقرار ہو۔ میں تو ڈر گئی۔ ہائے رام!! نہ جانے کیا ہونے والا ہے"!

"بینا تو وہی تھی جو میں نے کئی بار سُنی تھی۔ وہی میٹھے رسیلے سُر تھے۔ پھر میری چھتیاں یوں پھڑکنے کیوں لگی تھیں۔ مجھے ایسے کیوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی جنگلی پنچھی میرے سینے میں چکر کاٹ رہا ہو۔ اس ڈر کے مارے اٹھے جا رہا ہو کہ کوئی اُسے پکڑ نہ لے۔ جانے کیا ہوا تھا مجھے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، اور اب — اب نہ جانے دل میں اک بھیڑ سی کیوں لگی ہے۔ کیسی بھیڑ لگی ہے؟ کاہے کو جی یوں تڑپ رہا ہے، تڑپے جا رہا ہے۔

یہاں تک تو گیت میں دوشیزہ کی اس انوکھی، بے نام اضطرابی کیفیت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ تیسرے بند میں منظر بدلتا ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے دوشیزہ اپنے دل کی اُس اضطرابی کیفیت سے مانوس ہوتی جا رہی ہے، حیرانی کا عالم ختم ہوتا جا رہا ہے۔ حیرانی کی جگہ، وہ اب ایک مبہم سی رنگینی اور بے نام سی لذت محسوس کرنے لگی ہے۔ لاشعوری طور پر جاننے لگی ہے۔ کہ اس کے دل کی کیفیت کو رومانی چیزوں سے ایک تعلق سا ہے۔

جب چاند چمکتا ہے تو اس کے دل میں پھر وہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب شوخ نینوا اُس کی طرف دیکھتے ہیں تو سینے میں ویسا ہی طلاطم بپا ہونے لگتا ہے۔ جب برکھا میں چھوٹی چھوٹی بوندنیا ناچتی ہیں تو دل میں وہی پنچھی پھڑپھڑا کر چکر کاٹنے لگتا ہے۔ وہ سب اس بھید سے واقف معلوم ہوتے ہیں۔ وہ مسکراتا ہوا چندا، تکتے ہوئے نینوا اور ناچتی ہوئی بوندنیا۔ وہ سب جانتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ میٹھے بجائے پران کیوں گھبرا جاتے ہیں۔ چھتیاں کیوں پھڑکنے لگتی ہیں۔ من میں پنچھی کیوں اڑتے ہیں؟ لیکن وہ سب چپ کیوں ہیں، وہ اس راز کو چھپاتے کیوں ہیں، یہ کیا بھید ہے؟ ہائے رام!! کیسے جانوں گی میں؟ میں تو سوچتے سوچتے ہار گئی۔ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ جانے کیا ہے مجھے!!

شاعر نے دوشیزہ کے دل میں جذبات کی پہلی کروٹ دکھلانے کے لئے فلیش بیک (FLASH BACK) سے کام لیا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ دوشیزہ کو پہلی بیداری کے عالم میں پیش کرتا تو تصویر میں حیرانی اور اضطراب کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ ایسا کرنے سے بیداری کی کیفیت وقت کے ایک نقطہ سے منسلک ہو کر رہ جاتی اور فن کار اس کیفیت کی صرف ایک مختصر سی جھلک ہی دکھا سکتا۔ اس کی کینوس (CANVAS) محدود ہو کر رہ جاتی۔ فلیش بیک کی مدد سے اُس نے کیفیت میں تسلسل اور وسعت پیدا کر دی ہے اور تصویر میں تحرک — اس طرح اس قلمی تصویر کی حیثیت ایک سٹل (STILL) کی سی نہیں رہی۔ بلکہ ایک ریل (REEL) کی سی ہو گئی ہے اور اس میں زندگی پیدا ہو گئی ہے۔ بیداری کے عالم کو پورے طور پر وضاحت سے پیش کرنے کے لئے لازم تھا کہ دوشیزہ اس کیفیت سے کچھ کچھ مانوس ہو چکی ہوتی اور حیرت کی مجذوبیت سے نکل کر اضطراب کی رنگینی کو جان چکی ہوتی۔ اس جذباتی بجانے سے آشنا ہو چکی ہوتی۔ جو ہر

جوار کے عقب میں چلا آتا ہے اور چھا جاتا ہے۔

مکھڑے کے فوراً بعد ہی دوشیزہ اس کیفیت کے ورد کی بات چھیڑ دیتی ہے۔ جسے بیتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی شاعر نے دوشیزہ کی پہلی بیداری کو محبت یا محبوب سے متعلقہ کسی واقعہ سے منسوب نہیں کیا۔ اگر وہ مسکاتے نین اسے دیکھتے اور پھر چھیڑ کر چلے جاتے تو اس کا اضطراب بے نام نہ رہتا۔ اُس کی توجہ اپنی نفسیاتی کیفیت سے ہٹ کر ان چھیڑ دینے والے نینوں کی طرف منعطف ہو جاتی۔ اس لئے اس نے اولیں بیداری کی نفسی کیفیت کو پیش کرنے کے لئے بینا کی آواز سے کام لیا ہے۔ وہ آواز کانوں سے ہوتی ہوئی اس کے دل میں گونجتی ہے اور ایک ہنگامہ بپا کر دیتی ہے پھر چھاتی کا دھڑکنا اور من میں کسی آوارہ پنچھی کا اڑنا۔ جگر کاٹنا، ہاتھ نہ آنا، حقیقت نگاری کا ایک خوبصورت نمونہ ہے

یہاں فلیش بیک ختم ہو جاتا ہے۔ اب ہمارے روبرو وہ حیران اور ڈری ہوئی دوشیزہ نہیں۔ اس کی نفسیات میں دھندلے اندھیرے نہیں امڈ رہے۔ بلکہ رومان بھرے جذبات کی ہلکی سی رو پہلی سپیدی چھا رہی ہے۔ پھیلتے جا رہی ہے۔ اولین اضطراب کا جوار گذر چکا ہے۔ اُس کی جگہ لطیف و رنگین اور رومانی بھاٹا چھا گیا ہے۔ دوشیزہ کی نفسیت کے میدان پر ہلکی ہلکی چاندنی کھل گئی ہے۔ بھیگی بھیگی بوندنیا برس رہی ہیں اور دو تکتے نینوں سے دوچار ہونے کی لاشعوری خواہش ابھر رہی ہے جو اُسے اس بھید سے واقف کر سکتے ہیں ——

ادب لطیف کے سالنامے

علم وادب سے گہری دلچسپی اور شغف رکھنے والے حضرات سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ ہمارا ہر سالنامہ ایک مجتہدانہ مساعی کا حامل ہوتا ہے کیونکہ اس کے مضامین نظم ونثر ملک کے عظیم ترین فنکاروں کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ذہین اور بالغ نظر نقادوں نے ادب لطیف کے سالناموں کو ہمیشہ لٹریچر کی شاہراہ پر سنگِ میل تصوّر کیا ہے۔

ہمارے دفتر میں ادب لطیف کے گذشتہ سالناموں کی چند کاپیاں موجود ہیں۔ اِنکے مطالعہ سے اہلِ ذوق حضرات بہر طور مستفید ہو سکتے ہیں۔ یہ صرف سالنامے نہیں۔ بلکہ مستقل کتاب کا درجہ رکھتے ہیں۔

ذیل میں ان سالناموں کی قیمتیں درج کیجاتی ہیں۔ خواہشمند حضرات آرڈر بھجوا کر منگوا سکتے ہیں رقم منی آرڈر کے ذریعے بھیجیں یا وی۔پی سے منگوا لیں۔

سالنامہ ۱۹۳۶ء	دو روپے	سالنامہ ۱۹۴۳ء	ایک روپیہ آٹھ آنے
سالنامہ ۱۹۳۹ء	دو روپے	سالنامہ ۱۹۴۴ء	دو روپے آٹھ آنے
ڈرامہ نمبر ۱۹۳۹ء اپنی نوعیت کی واحد پیشکش	تین روپے آٹھ آنے	سالنامہ ۱۹۴۵ء	تین روپے
سالنامہ ۱۹۴۶ء	تین روپے		

مینجر، ادبِ لطیف، سرکلر روڈ، لاہور

تنلی پرنٹنگ پریس لاہور میں چوہدری برکت علی اڈیٹر نے چھپوا کر دفتر ادب لطیف سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔

ناول

لکیر	عصمت چغتائی	٦/٨/-
ی ایک رات	سجاد ظہیر	١/٤/
سخنوان	غلام عباس	١/٤/-
ی آپ بیتی	ایم - اسلم	٣/٤/-
	خواجہ احمد عباس	زیر طبع

ڈرامے

ے ڈرامے	سعادت حسن منٹو	٣/-/-
ورتیں	"	١/٤/-
	"	١/٨/-
	اپندر ناتھ اشک	٤/-/-
ے	"	٢/-/-
یات	"	٢/-/-
کی زندگی	اندریف	١/٨/-
موتے تک	ناصر شمسی	٣/-/-

منظومات

مارہمات	جوش ملیح آبادی	٥/-/-
ے حکایت	" "	٤/-/-
	" "	٣/٨/-
	" "	٢/٨/-
و حکمت	" "	٤/-/-
و سبو	" "	٥/-/-
	ن - م - راشد	٢/٨/-
فریادی	فیض احمد فیض	٢/-/-
ح م	اختر شیرانی	٢/-/-
رزم	وفا انبالوی	-/١٢/-
کی بہترین نظمیں	حلقہ ارباب ذوق	/١٢/-
کی منتخب نظمیں	ادارہ	١/٢/-
کی بہترین نظمیں	حلقہ ارباب ذوق	١/٤/-
کی منتخب نظمیں	ادارہ	١/٤/-
"	" "	١/٤/-
گاہ	مخمور جالندھری	٢/-/-
ں	قتیل شفائی	١/٨/-
	اختر انصاری	١/٨/-

میراجی کے گیت	میراجی	/١٢/-
فروزاں	معین احسن جذبی	١/٨/-
زہر خندہ	یوسف ظفر	٢/-/-
وسعتیں	سلام مچھلی شہری	١/٨/-
شعلہ ساز	فراق گورکھپوری	٥/-/
بادۂ مشرق	ساغر نظامی	٤/٨/-
تلخیاں	ساحر لدھیانوی	١/١٢/-
آتشکدہ	عبدالحمید عدم	زیر طبع
پرتو	جاں نثار اختر	"
تاریک سیارہ	اختر الایمان	"
غزلیں	حفیظ ہوشیارپوری	"
ہیولے	فکر تونسوی	٢/٤/-

اجتماعیات

انتہا پسند کمیونسٹ	لینن	
سامراج	"	
مشین اور مزدور	باری	١/٤/-
آزادی کی راہیں	برٹرینڈ رسل	٦/٨/-
راجہ اور کسان	لیونارڈ م شف	-/٨/-
صاحب اور مذہب	" "	-/٨/-
بابو اور مزدور	" "	-/٨/-
سوشلزم	اینگلز	١/٤/-
سرمایہ داری	عبداللہ ملک	-/٨/-
جاگیر داری	" "	-/٨/-
آمریت	اکرام قمر	-/٨/-
پاکستان (اُردو)	چوہدری افضل حق	١/٤/-
احساس کمتری	شیر محمد اختر	-/٨/-
عربوںکی قومی تحریک:	مسعود علی ندوی	-/٨/-
معشیت زر	ابن الحسن	-/٨/-
گاندھی ازم - نیشنلزم - سوشلزم :	ایم. این. رائے	١/٨/-
سوویٹ روس کے مزدور	گوپال متل	-/٨/-
سائنس اور دنیا	ایچ - جی ویلز	-/٨/-
رائے کے مضامین	ام - این رائے	-/٨/-

ادبیات و تنقیدات

ادب کثیف	حاجی لق لق	١/٤/-
ہندی کے مسلمان شعراء:	عبداللہ بٹ	-/٨/-
اقبال اور اسکا پیغام	محمد رفیق خاور	-/٨/-
اُردو ڈراما	عبدالسلام خورشید	-/٨/-
عبارے	ممتاز مفتی	زیر طبع